رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۷۳۰

جلد ۵۹، عدد ۳ — جنوری ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جنوری ۱۹۶۳ء	جلد ۵۹

ابوالخیر مودودی، پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ
لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اس امر کا دعویٰ تو مشکل ہے کہ خاکسار نے مرزا غلام احمد قادیانی کی ساری کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا ہے، لیکن چند برس پیشتر مجھے ان کی بعض ایسی کتب پڑھنے کا موقع ملا جو قادیانیوں کے ہاں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کتب کے علاوہ میں "الفضل" اخبار بھی برابر دیکھتا رہا۔ ان چیزوں کے مطالعہ کے بعد میرا تاثر یہ ہے کہ مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اس لیے وہ اور اُن کو نبی تسلیم کرنے والے کبھی دائرہ اسلام کے اندر نہیں رہ سکتے کیونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کسی نئے نبی کی نبوت بحیثیت مسلمان تسلیم نہیں کی جاسکتی یہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے اس گروہ کے ساتھ اپنا رشتہ بالکل منقطع کرلیا ہے اور دوسری طرف خود قادیانیوں نے بھی اُن لوگوں کو جو اُن کی نبوت کے قائل نہیں کافروں کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔

اس حقیقت کو خود مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اپنی مختلف تحریروں میں واضح کیا ہے:

"علاوہ اس کے جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیش گوئی موجود ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ آخری زمانے میں میری امت میں سے ہی مسیح موعود آئے گا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی خبر دی تھی کہ میں معراج کی رات میں مسیح ابن مریم کو ان نبیوں میں دیکھ آیا ہوں جو اس دنیا سے گذر گئے ہیں اور یحییٰ شہید کے پاس دوسرے آسمان میں اُن کو دیکھا ہے۔ اور خدا نے میری سچائی کی گواہی کے لیے تین لاکھ سے زیادہ آسمانی نشان ظاہر کیے اور آسمان پر خسوف و کسوف رمضان میں ہوا۔ اب جو شخص خدا اور رسول کے احکام

کو نہیں مانتا اور قرآن کی تکذیب کرتا ہے اور عمداً خدا تعالیٰ کے نشانوں کو رد کرتا ہے اور مجھ کو باوجود صدہا نشانوں کے مفتری ٹھہراتا ہے تو وہ مومن کیونکر ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ مومن ہے تو میں بوجہ افترا کرنے کا فر ٹھہرا کیونکہ میں ان کی نظر میں مفتری ہوں۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)

"کفر دو طرح پر ہے۔ ایک کفر یہ کہ ایک شخص اسلام ہی سے انکار کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لیے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے کافر ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔"

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۷۹ از مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

مرزا صاحب کی ان تصریحات کے بعد ایک معقول انسان کے لیے تعبیر و تاویل کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اُن کا موقف اتنا صریح اور واضح ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو پھر جو انہیں نبی نہیں مانتے وہ کافر ہیں۔ اور اگر اُن کا دعویٰ باطل ہے تو پھر وہ اور اُن کے ماننے والے دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہیں۔ اسی مسلک کی صراحت مرزا صاحب کے بڑے بڑے معتقدین نے کی ہے۔ مثال کے طور پر اُن کے فرزند صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب قادیانی نے اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے بڑے واشگاف الفاظ میں لکھا ہے:

"اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں دو شخصوں کو سب سے بڑا کافر بیان فرمایا ہے۔ اوّل وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے الہام کیا ہے حالانکہ درحقیقت اسے کوئی الہام نہیں ہوا۔ دوسرے وہ جو خدا کے کلام کی تکذیب کرتا ہے۔ جیسے فرمایا: ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا و کذب بایاتہ (اس آیت میں ظالم سے کافر مراد ہے)

اور حضرت مسیح موعود نے بھی ظالم کے یہی معنی کیے ہیں" (دیکھو حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳ حاشیہ)

اب مسیح موعود کا یہ دعویٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ نعوذ باللہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے اور محض مفتری علی اللہ کے طور پر دعویٰ کرتا ہے تو ایسی صورت میں نہ صرف وہ کافر بلکہ بڑا کافر ہے۔ اور یا مسیح موعود اپنے دعویٰ الہام میں سچا ہے اور خدا سچ مچ اس سے ہمکلام ہوتا تھا اور اس صورت میں بلا شبہ یہ کفر انکار کرنے والے پر پڑے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خود فرمایا ہے۔ پس اب تم کو اختیار ہے کہ مسیح موعود کے منکروں کو مسلمان کہہ کر مسیح موعود پر کفر کا فتویٰ لگاؤ اور یا مسیح موعود کو سچا مان کر اس کے منکروں کو کافر جانو۔

(کلمۃ الفصل مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب قادیانی مندرجہ رسالہ ریویو آف ریلیجنز ص ۱۲۳ نمبر ۳ جلد ۱۴)

مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت کی یہ کوئی ایسی تصریح نہیں جو قادیانی لٹریچر کی سلوٹوں میں سے ڈھونڈ کر لائی گئی ہو۔ اس نوعیت کی بے شمار تصریحات اُن کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اور ان کے درمیان ایک معنوی ربط پایا جاتا ہے۔ پھر مرزا صاحب کے ماننے والوں نے اپنے طرز عمل سے بھی اس موقف کے عملی مضمرات کی پوری طرح تشریح کی ہے۔ اُن کے ہاں امتِ مسلمہ کا ہر وہ فرد جو غلام احمد صاحب قادیانی کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتا وہ دائرۂ اسلام سے یکسر خارج ہے اور اُسی سلوک کا مستحق ہے جو ایک مسلمان کو غیر مسلم سے کرنا چاہیے۔

کلمۂ شہادت کے اقرار کے بعد امتِ مسلمہ کا ہر فرد اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک امام کی اقتداء میں نماز ادا کرے، مسلمانوں کے ساتھ رشتے ناطے کرے اور وفات کے وقت اُس کے دینی بھائی اجتماعی طور پر اُس کی نماز جنازہ ادا کر کے، خداوند تعالیٰ کے حضور میں اُس کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ عبادت اور معاشرتی رشتے ہی درحقیقت کسی ملت

کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اجتماعی عبادت سے ایک قوم کے مختلف عناصر کے درمیان روحانی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو بالآخر ضمیر و وجدان کی یک جہتی کو معرض وجود میں لاتی ہے۔ اسی طرح رشتے ناطے افراد کے جسموں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں اور ان کی مدد سے ایک ایسی معاشرت جنم لیتی ہے جو مختلف افراد کے اخلاق و اطوار کو ایک رنگ میں رنگ کر ان کے اندر فکر و عمل کی وحدت پیدا کرتی ہے یہی روحانی یگانگت اور جسمانی قرب وہ دو بنیادیں ہیں جن پر کسی ملت کی تشکیل کی جاتی ہے۔ ان دو بنیادوں کو دنیا کی کوئی ہوشمند قوم ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ خصوصاً وہ قوم جس کی تعبیر میں رنگ، نسل، وطن اور زبان کا کوئی جزو شامل نہ ہو، اس کے لیے تو اجتماعی عبادات اور معاشرتی تعلقات روح کی طرح غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور انہیں امتیازات کی وجہ سے وہ قوم دوسری اقوام سے ممیز اور ممتاز ہوتی ہے۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ ان دو اہم معاملات میں مرزا غلام احمد صاحب کے معتقدین نے کونسا طرز عمل اختیار کیا ہے اور اُن کے اس افسوسناک طرز عمل کو دیکھنے کے بعد انہیں امت مسلمہ کا ہی ایک "فعال فرقہ تسلیم" کرنے کی کہاں تک گنجائش رہ جاتی ہے۔

نماز کے بارے میں مرزا صاحب اور ان کے رفقاء کار کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

"پس یاد رکھو کہ جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے۔ تمہارے پر حرام اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا امام ہی جو تم میں سے ہو۔ اسی کی طرح حدیث بخاری کے ایک پہلو میں اشارہ ہے کہ امامکم منکم یعنی جب مسیح نازل ہوگا تو تمہیں دوسرے فرقوں کو جو دعوائے اسلام کرتے ہیں سب کو ترک کرنا پڑے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ پس تم ایسا ہی کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا الزام تمہارے سر پر ہو اور تمہارے عمل حبط ہو جائیں اور تمہیں کچھ خبر نہ ہو۔" (اربعین نمبر ۳ ص ۳۴۔ حاشیہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب۔ بحوالہ قادیانی مذہب از محمد الیاس برنی)

پھر مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے بھی اس امر کی تاکید کرتے ہوئے بار بار کہا ہے:

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سختی سے تاکید فرمائی ہے کہ کسی احمدی کو غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ باہر سے لوگ اس کے متعلق بار بار پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تم جتنی دفعہ بھی پوچھو گے اتنی دفعہ ہی میں یہی جواب دوں گا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں، جائز نہیں، جائز نہیں۔"

(انوار خلافت۔ مجموعۂ تقاریر میاں محمود احمد صاحب ص ۸۹)

اسی طرح نماز جنازہ کے متعلق اس گروہ کا رویہ دیکھیے:

"حضرت مرزا صاحب نے اپنے بیٹے (فضل احمد صاحب) مرحوم کا جنازہ محض اس لیے نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا۔" (اخبار الفضل قادیان مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۱ء جلد ۹ نمبر ۴۷ - بحوالہ قادیانی مذہب)

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو لوگ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، اس کا جنازہ جائز نہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک وہ احمدی نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ غیر احمدیوں کو لڑکی دے دیں اور وہ اپنے اس فعل سے توبہ کیے بغیر فوت ہو جائیں ان کا جنازہ بھی جائز نہیں۔ غیر مبایعین (لاہوری جماعت) کے گروہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (مرزا صاحب) کو کسی قسم کی بھی نبوت حاصل نہیں تھی اور وہ نبوت کے معاملے میں حضرت مسیح موعود کے الفاظ کو غلطی پر محمول کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی احمدی نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کا بھی جنازہ جائز نہیں۔" (میاں محمود احمد صاحب قادیانی خلیفہ قادیان کا مکتوب مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۶ء)

قادیانیوں کے ہاں اس معاملے میں اس قدر شدت ہے کہ وہ کسی غیر احمدی بچے کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔

"ایک صاحب نے عرض کیا کہ غیر مبایع (لاہوری جماعت) کہتے ہیں کہ غیر احمدی کے بچے کا جنازہ کیوں نہ پڑھا جائے وہ تو معصوم ہوتا ہے اور کیا یہ ممکن نہیں وہ بچہ جوان

ہو کر احمدی ہوتا۔

اس کے متعلق (میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان) نے فرمایا جس طرح عیسائی بچے کا جنازہ نہیں پڑھا جا سکتا۔ اگرچہ وہ معصوم ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک غیر احمدی کے بچے کا بھی جنازہ نہیں پڑھا جا سکتا۔" (ڈائری میاں محمود احمد صاحب۔ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد ۱۰ نمبر ۳۲ - مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء) بحوالہ قادیانی مذہب از الیاس برنی۔

پھر نکاح کے معاملے میں بھی قادیانیوں کے ہاں جو تشدد پایا جاتا ہے اُس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اول حکیم نورالدین نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔"

(انوارِ خلافت صد ۹۳ مصنفہ میاں محمود احمد)

مرزا صاحب اور ان کے معتقدین کی تحریروں اور تقریروں کے جو اقتباسات گزشتہ صفحات میں نقل کیے گئے ہیں۔ یہ اپنے معانی اور مطالب کے لحاظ سے بڑے واضح ہیں۔ اس لیے ان کی کوئی دوسری تعبیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ کوئی استثنائی مثالیں بھی نہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ یہ کسی مخالف اور دشمن کی فریب کاریاں ہیں۔ پھر انہیں یہ کہہ کر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی مجذوب کی عارضی اور خواب آسا کیفیات کا اظہار ہے جو اُس نے جذب و مستی کے عالم میں "یونہی" کہہ ڈالیں۔ اس طرح کی تحریریں جن میں ان افکار و نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔ تعداد کے اعتبار سے اتنی زیادہ ہیں کہ حسن ظن کی

آخری سرحدی کو چھو کر بھی انہیں استثنائی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ان میں جذب و مستی کی وہ خود فراموشی اور انفعالیت بھی ناپید ہے جو عام طور پر اس راہ کے مسافروں کے حصے میں آتی ہے۔ مرزا صاحب کا دعوائے نبوت ایک خاص اندازِ فکر کا ترجمان ہے، جس پر ایک مخصوص نظامِ عمل کی تشکیل ہوئی ہے پھر اس نظامِ فکر و عمل کو قائم کرنے کے لیے ایک ایسی جماعت معرضِ وجود میں لائی گئی ہے جو اپنی ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے امتِ مسلمہ سے بالکل الگ اور جُدا گانہ ہے اس بنا پر دوسرے مسلمانوں کو بالکل کافر سمجھتے ہوئے اُن کے ساتھ زندگی کے ہر معاملہ میں غیر مسلموں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مجھے ان حضرات کے موقف پر ہمیشہ حیرت ہوئی ہے جو مرزا صاحب کے اس کھلے ہوئے دعوائے نبوت، پھر اس خانہ ساز نبوت کے انکار و اقرار پر کفر اور اسلام کے انحصار اور اس کے نتیجے میں ایک نئی امت کی تشکیل کے باوجود اس گروہ اور اس کی قیادت کو دائرۂ اسلام کے اندر رکھنے پر مصر ہیں۔

اس موقف کو اختیار کرنے والوں میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو غلط تعلیم و تربیت کی وجہ سے عقیدۂ ختمِ نبوت کی اصل اہمیت ہی سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ لوگ دراصل معذور ہیں۔ اور دینی معاملات میں ان کے نظریات کوئی وزن نہیں رکھتے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر وہ حضرات ہیں جو دینی تعلیمات کے علمبردار ہیں اور اسلامی عقائد اور اُن کے مضمرات کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی قادیانیوں کو مسلمان سمجھنے پر بضد ہیں۔ اس گروہ کی ایک نمایاں شخصیت حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی ہیں۔ مولانا کی ذاتِ گرامی اس وقت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کے قلم نے دین کی بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کے ہر طبقہ میں وہ بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خود راقم الحروف اُن کے علم و فضل کا بڑا معترف ہے اور اُن کی ذاتِ گرامی سے اُس کی عقیدت اُن کے کسی مُرید سے کم نہیں۔

مولانا کی دین سے گہری محبت اور دینی معاملات میں اُن کی بصیرت کی وجہ سے میں ہمیشہ اس بات کا آرزومند رہا کہ کاش مولانا کے وہ دلائل معلوم ہو سکیں جن کی بنا پر وہ قادیانیوں کو دائرۂ اسلام میں شامل کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ خط کے ذریعہ اُن سے اس معاملہ میں رہنمائی حاصل کرنے کا ارادہ کیا لیکن اُن کی عدیم الفرصتی کے پیشِ نظر پھر اُسے ملتوی کر دیا۔ چند سال پیشتر جب وہ اسلامی کلوکیم میں لاہور تشریف لائے اُن کی خدمتِ اقدس میں اسی غرض سے حاضر بھی ہوا لیکن ان کی مصروفیات کے پیشِ نظر اُن سے گزارش نہ کر سکا۔ اسے محض بخت و اتفاق سمجھیے کہ پچھلے دنوں بعض لوگوں کے استفسار پر انہوں نے اس موضوع پر کھل کر اظہارِ خیال فرما دیا ہے۔ ہم ذیل میں خطوط اور مولانا موصوف کے جوابات درج کرتے ہیں تاکہ اُن کا موقف اور اُس کے دلائل پوری طرح قارئین کے سامنے آ جائیں۔

مراسلہ: صدقِ جدید۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

ایک مخلص کا الٹی میٹم

"بچپن ہی سے آپ کے ساتھ ایک خصوصی تعلقِ خاطر رہا ہے۔ شاید ۱۹۲۳ء-۲۴ء کا زمانہ ہے جب میں نے آپ کو . . . لکھنے کی دعوت دی اور آپ نے "یتیم کا راج" اور . . . " ہمارے بھجوائے، جو آج تک بےشمار دفعہ چھپ کر ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم ہو چکے ہیں اب بھی اگر کوئی ایمان افروز چیز سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھ کر بھجوائیں تو بلا اشاعت اور مفت تقسیم کا بندوبست کروں گا۔ آپ سے راقم السطور کو شدید اسلامی گلہ ہے کہ آپ قادیانیت کی پشت پناہی کرتے ہیں اس سے آپ کی محبوبیت میرے خیال میں مجروح ہو چکی ہے۔ قادیانیت، خواہ وہ ربوہ کی ہو یا احمدیہ بلڈنگس کی، دینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف انگریز کی سازش ہے۔ یہ آپ سے محبت کا تقاضا ہے کہ میں آپ سے شدت کے ساتھ یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ قادیانیت سے اپنے دامن کو ہمیشہ کے لیے بچا کر رکھیں۔ آپ کی تحریریں قادیانیت کی تعریف میں جب قادیانی اخبارات پیش کرتے ہیں۔ تو دل چاہتا ہے کہ آپ سے پوری جنگ کی جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ . . . بلکہ آج سے

نہیں سالہا سال سے آپ کی سچی باتیں التزام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں .... ضرور آپ کی نظر سے گزرتا ہوگا - آپ کے دل کی تمام اسلامی خوبصورتی میرے نزدیک اس وقت غارت ہو جاتی ہے جب آپ کے قلم سے قادیانیت کی تعریف میں کلمات نظر آتے ہیں یہ ایک ایسا وبال ہے جو آپ اپنے اوپر لے رہے ہیں یہ دوسرے لوگوں کی گمراہی کا وبال ہے جس کی ذمہ داری قیامت کے دن آپ پر ہوگی -

ایڈیٹر .... (کراچی)

صدق - ان پاکستانی ایڈیٹر صاحب نے جس پُر زور پیرائے میں اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا ہے ، اسے بجنسہٖ نذر ناظرین کر دیا گیا ، اور یہ تحریر اپنی نوعیت کی کوئی پہلی نہیں ، بیسیوں تحریریں اسی مضمون کی بڑے سے بڑے عزیز مخلصوں کی طرف سے آچکی ہیں - اور برابر آتی ہی رہتی ہیں - لب لباب یا حاصل ان سب تحریروں کا کچھ یوں ہاتھ آتا ہے :

قادیانیت اپنے سارے اجزا سمیت ایک سو فی صدی باطل اور دشمنِ اسلام و مخربِ ایمان تحریک ہے - جس کا ذکر کسی اعتبار سے بھی موقع داد و تحسین پر قابلِ برداشت نہیں - یہ ایمان و ضمیر کا معاملہ ہے جس میں کسی مصالحت ، مفاہمت ، مداہنت اور تساہل کی گنجائش نہیں "

بے شک ایسا ہی ہوگا - لیکن اسے کیا کیجیے کہ بعینہٖ یہی دینی مصلحت اندیشی یا (STRATEGY) جو آپ حضرات کو جوش و خروش اور تشدد پر آمادہ کرتی رہتی ہے - کچھ اللہ کے بندوں کو ٹھیک اس کے برعکس نرمی اور رواداری کی طرف بھی لا رہی ہے ! آپ حضرات کی نظر جب بھی پڑتی ہے تو مابہ الاختلاف پر ، اور اس سے طبیعت فوراً اشتعال قبول کر لیتی ہے - لیکن کچھ نظریں ایسی بھی ہیں جو مابہ الاشتراک کی تلاش میں رہتی ہیں - اور زیادہ سے زیادہ اسی پر پڑتی ہیں - قدرۃً اس گروہ کا دائرہ اقل قلیل ہے

کہنا یہ ہے کہ جب اشتراک عقیدۂ توحید میں موجود ہے، تصدیق رسالت میں ہے۔ عقیدۂ آخرت میں ہے۔ حقانیت قرآن میں ہے۔ کلمہ میں ہے، قبلہ میں ہے، عبادات وفرائض پنج گانہ میں ہے۔ اور اختلاف صفات رسالت میں صرف ایک صفت خاتمیت میں بھی نہیں، بلکہ صرف تعبیر خاتمیت میں ہے تو یہ امت کے حق میں کہاں کی دوستی ہے کہ اسی کو اتنا اچھالا جائے اور نمایاں کیا جاتا رہے؟

اور مدیر صدق کے مسلک کی وسعت تو اس باب میں بالکل واضح وظاہر ہے اس نے تو داد اسرائیلی کی دی ہے۔ بارہا تحسین فرنگی تہذیب کے بعض پہلوؤں (تنظیم، پابندیٔ وقت، تجارتی دیانت وغیرہ) کی کی ہے۔ انگریزی حکومت کے روشن پہلوؤں کو یاد کیا ہے۔ اور گاندھی جی، جواہر لال، ٹیگور، سندر لال وغیرہ کتنے ہی ہندوؤں کا ذکر خیر موقع موقع سے کیا ہے۔

عجیب اتفاق کہ عین اسی وقت ایک احمدی مبلغ کا مفصل تبلیغ نامہ لاہور سے مدیر صدق کو موصول ہوا ہے ان شاء اللہ آئندہ نمبر میں مفصل تبصرہ کے ساتھ درج ہوگا۔ جذباتیت اور غلو وتعصب سے بچ کر راہِ حق پر قائم رہنے کی توفیق اللہ ہم سب کو عطا کرے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ مولانا کے اس جواب سے ہمیں تشفی نہیں ہوئی۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ قادیانیوں کے ساتھ بہت سے معاملات میں ہمارا اشتراک ہے۔ بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کیا بعض عقائد میں اشتراک ہی صرف کسی فرد یا گروہ کو دائرۂ اسلام میں شامل کرنے کی ضمانت ہے۔ اگر اسی اصول کو ذرا وسعت دے دی جائے تو پھر بہائیوں کو بھی مسلمانوں کا ایک فرقہ شمار کرنا پڑے گا۔ یہ مانا کہ ان کے اختلافات امت مسلمہ سے قادیانیوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں لیکن آخر ان کے معتقدات اور مسلمانوں کے عقائد میں بھی ساری چیزیں تو

ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ اُن کے اور ہمارے درمیان بھی بہت سے معاملات میں اشتراک کی راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔ "مابہ الاشتراک کی تلاش" کا جو جذبہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام کے اندر رکھنے پر ہمیں مجبور کرتا ہے وہ آخر بہائیوں اور اسی نوعیت کے دوسرے گروہوں کو امتِ مسلمہ کا حصہ قرار دینے میں آخر کیوں مانع ہے۔ اُن کے اور ہمارے درمیان بھی بہت سی چیزوں میں اشتراک ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ مولانا سے زیادہ ان گروہوں کے عقائد سے کون واقف ہوگا میں ذیل میں بہاء اللہ کے چند کلمات نقل کرتا ہوں جنہیں دیکھ کر اس امر کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو کچھ اس شخص نے کہا ہے وہ بھی سراسر کفر نہیں، بلکہ اس کے بہت سے اقوال اسلامی تعلیمات ہی سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں:

تمام نیکیوں کا سرچشمہ: خدا پر اعتماد، اس کے حکم کی اطاعت اور اس کی رضا پر راضی رہنا ہے۔

دانائی کا جوہر: خداوند رب العزت کا خوف، سطوت و قہر الٰہی کا ڈر اور خدائی عدل و قضا کے مظاہر سے ترس و بیم۔

دین کا جوہر: اُس کا اقرار کرنا ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا اور جو کچھ اُس کی محکم کتاب میں حکم دیئے گئے ہیں اُن کی متابعت کرنا ہے۔

محبت کی جڑ: یہ ہے کہ بندہ اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو اور اُس کے ماسوا سے منہ پھیر لے۔ اپنے مولیٰ کے ارادے سے الگ اُس کی اور کوئی مراد نہ ہو۔

کفر: خدا کے ساتھ کسی کو شریک بنانا اور غیر اللہ پر بھروسہ کرنا اور خدا کے فیصلوں سے گریز کرنا۔

توکل: یہ ہے کہ بندہ خدا پر کامل اعتماد کرتے ہوئے دنیا میں کسی کاروبار یا شغل میں مشغول رہے اور اپنی نظر اپنے مولیٰ کی طرف لگائے رکھے کیونکہ بندے کے تمام امور ہر حال میں خدا کی طرف راجع ہوتے ہیں۔

<u>تمام شرارت یا بدی کی جڑ</u>: انسان کا خدا سے غافل ہو جانا اور اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرنا

(عالمگیر دین کے بہائی اصول)

مندرجہ بالا اقوال کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کیا ان میں عقیدہ توحید، اور تعلق باللہ کی تعلیم نہیں دی گئی۔ لیکن ان معاملات میں اشتراک کے باوجود بہائیوں کو مسلمان شمار نہیں کیا جاتا اور نہ ہی وہ خود اس بات کے دعویدار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہاء اللہ کے ماننے والے اُن معتقدات کو اُن کے سارے لوازم کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے جو مسلمان بننے کے لیے لابدی ہیں۔ اصل معاملہ اشتراک کا نہیں بلکہ کسی ایسے عقیدے سے انحراف کا ہے جو دین میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

پھر مولانا کا یہ ارشاد کہ قادیانیوں کا اور مسلمانوں کا اختلاف صفاتِ رسالت میں صرف ایک صفت خاتمیت میں بھی نہیں بلکہ صرف تعبیرِ خاتمیت میں ہے" محلِ نظر ہے۔ مولانا سے زیادہ اس امر سے کون واقف ہے کہ عقیدۂ ختمِ نبوت اسلام کے اندر اساس اور بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس معاملے میں مسلمانوں کے ہاں کس قدر اتفاق و اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی تعبیر کو کہاں تک گوارا کیا گیا ہے۔ میں مولانا محترم کی خدمتِ اقدس میں عرض کرتا ہوں کہ آپ براہِ کرم یہ بتائیں کہ کیا صحابہ، تابعین اور تبع تابعین یا اس کے بعد بھی کسی قابلِ قدر ہستی نے خاتمیت کی یہ تعبیر کی ہے جو قادیانی کر رہے ہیں اور پھر ملت نے اس کے ساتھ اُسی نرمی اور رواداری کا برتاؤ کیا ہے جس کی تلقین آپ فرما رہے ہیں۔ منطق اور زبان و ادب پر آپ کو جو غیر معمولی عبور حاصل ہے، اُسے دیکھتے ہوئے ذہن یاور نہیں کرتا کہ آپ تعبیر کے حدود و قیود سے پُوری طرح آگاہ نہ ہوں گے۔ تعبیر اس حد تک گوارا ہوتی ہے جس حد تک کسی معاملہ کا اصل مقصد نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور اُس کے مضمرات سے تصادم نہ ہو۔ تعبیر ایک قسم کا استنباط ہے جس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک بنیادی عقیدہ جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے اُسے موڑ توڑ کر ایسے معانی پہنا لیے جائیں جن کی اُس میں سے گنجائش نہ نکلتی ہو اور وہ معانی اُس عقیدہ کی بنیادوں کو ہی منہدم کر کے رکھ دیں۔ اگر عقیدہ ختمِ نبوت

میں خاتمیت کی یہ تعبیر یعنی اجرائے نبوت ممکن ہوتی جو اس وقت قادیانی کر رہے ہیں، تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ امت مسلمہ اُن جھوٹے مدعیانِ نبوت کے ساتھ ہمیشہ حسن ظن رکھتی۔ اُن کی "اسلامی خدمات" کی مدح و ستائش کرتی اور اُن کے ساتھ کبھی اُس سختی کا برتاؤ نہ کرتی جو فی الواقع اُس نے کیا ہے۔ تعبیر کے اختلافات، کی آخر بہت سے دوسرے معاملات میں بھی تو مثالیں موجود ہیں۔ امت مسلمہ کی عظیم اکثریت کا اُن کے بارے میں احساس کیوں اتنا نازک نہیں جتنا کہ اس عقیدہ کے بارے میں ہے۔

دوسرے اگر معاملہ صرف تعبیر کا ہوتا تو خود قادیانی بھی اسے کبھی اتنا نہ اچھالتے جتنا کہ اسے اچھالا اور نمایاں کیا جا رہا ہے۔ جو فرد بھی اُن کی اس تعبیر سے متفق نہیں ہوتا وہ اسے برملا کافر کہتے ہیں اور اسے دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ تعبیر کے معمولی سے اختلاف پر یہ شدت اور اصرار اور اس مسئلہ پر دونوں طرف سے یہ اتفاق و اتحاد اس بات کی کھلی غمازی کر رہا ہے کہ یہ معاملہ کوئی فروعی نوعیت کا نہیں بلکہ اساسی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے جب بھی اس پر خفیف سی زد پڑتی ہے تو دونوں طرف کے لوگ تلملا اٹھتے ہیں۔ آخر مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے درمیان بھی تو تعبیر کے کئی اختلافات پائے جاتے ہیں اور ان اختلافات کی بنا پر بعض غیر متوازن لوگ اپنے مخالفین پر کفر کے فتوے عائد کر دیتے ہیں لیکن کیا ان فتووں نے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی پر وہی دُور رس اثرات مترتب کیے ہیں جو کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے اختلاف کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کیا ان فتووں کی وجہ سے امتِ مسلمہ کے مختلف طبقے ایک دوسرے سے کٹ کر بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ کیا اس بنا پر انہوں نے اپنے معاشرتی تعلقات کو یکسر منقطع کر لیا ہے۔ کیا ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز ادا کرنے، وفات کے وقت دعائے مغفرت کرنے اور رشتہ ناطہ کرنے میں مسلمانوں کی عام آبادی میں وہی تنگ نظری اور تعصب پایا جاتا ہے جس کا مظاہرہ قادیانی کرتے ہیں۔ مسلکِ اہل حدیث کے بعض غیر محتاط علماء نے احناف کی تقلیدانہ روش کو شرک سے

تعبیر کیا ہے۔اسی طرح چند پُرجوش حنفیوں نے بھی اہلِ حدیث کے بعض مسائل سے اختلاف کرتے ہوئے اُسے بے دینی قرار دیا ہے۔لیکن ان فتووں کی موجودگی مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی کو قطعاً زیروزبر نہیں کرسکی۔ایک تو ان فتووں پر کبھی بھی ایک ہی مسلک کے علماء کے اندر کامل اتفاق واتحاد نہیں ہوتا۔اگر ایک غیر محتاط عالم کسی دوسرے مسلک پر کوئی فتویٰ عائد کرتا ہے تو اُسی مسلک کے عامل علماء کی متین اور سنجیدہ جماعت خود آگے بڑھ کر اس سے بیزاری کا اظہار کردیتی ہے۔دوسرے اس سے معاشرتی زندگی میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہونے پاتا اور حیاتِ اجتماعی کی جوئے رواں فطری رفتار سے اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ہماری تاریخ میں کتنی بار تکفیر کے بازار گرم ہوئے ہیں لیکن اُن کی وجہ سے ہماری ہیئتِ اجتماعی میں کوئی غیر معمولی بگاڑ اور اختلال پیدا نہیں ہوا۔

کیا ان سارے حقائق کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمارے اور قادیانیوں کے درمیان تعبیر کا جزوی اختلاف ہے اور یہ نوعیت کے اعتبار سے اُس اختلاف سے ملتا جلتا ہے۔جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین پایا جاتا ہے۔

تفہیم القرآن

یٰسٓ

(۲)

انہیں مثال کے طور پر اُس بستی والوں کا قصہ سناؤ جبکہ اس میں رسول آتے تھے[۱۰] ہم نے ان

---

[۱۰] قدیم مفسرین بالعموم اس طرف گئے ہیں کہ اس بستی سے مراد شام کا شہر انطاکیہ ہے اور یہاں جن رسولوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے انہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں قصے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اُس زمانہ میں انطیخش اس علاقے کا بادشاہ تھا۔ لیکن یہ سارا قصہ ابن عباس، قتادہ، عکرمہ، کعب اَحبار اور وہب بن مُنَبِّہ وغیرہ بزرگوں نے عیسائیوں کی غیر مستند روایات سے اخذ کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے بالکل بے بنیاد ہے۔ انطاکیہ میں سلوقی خاندان (SELEUCID DYNASTY) کے ۱۳ بادشاہ انٹیوکس (ANTIOCHUS) کے نام سے گزرے ہیں اور اس نام کے آخری فرمانروا کی حکومت، بلکہ خود اس خاندان کی حکومت بھی ۶۵ قبل مسیح میں ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں انطاکیہ سمیت شام و فلسطین کا پورا علاقہ رومیوں کے زیر نگیں تھا۔ پھر عیسائیوں کی کسی مستند روایت سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ خود حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے حواریوں میں سے کسی کو تبلیغ کے لیے انطاکیہ بھیجا ہو۔ اس کے برعکس بائیبل کی کتاب اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ صلیب کے چند سال بعد عیسائی مبلغین پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو، نہ اللہ کے رسول نے مامور کیا ہو، وہ اگر بطور خود تبلیغ کے لیے نکلے ہوں تو کسی تاویل کی رو سے بھی وہ اللہ کے رسول قرار نہیں پا سکتے۔ علاوہ بریں بائیبل کے بیان کی رو سے انطاکیہ پہلا شہر ہے جہاں

کی طرف دو رسول بھیجے اور انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لیے بھیجا اور ان سب نے کہا "ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں"۔

بستی والوں نے کہا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان[11]، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز

کثرت سے غیر اسرائیلیوں نے دینِ مسیح کو قبول کیا اور مسیحی کلیسیا کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ حالانکہ قرآن جس بستی کا ذکر یہاں کر رہا ہے وہ کوئی ایسی بستی تھی جس نے رسولوں کی دعوت کو رد کر دیا اور بالآخر عذابِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ تاریخ میں اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انطاکیہ پر ایسی کوئی تباہی نازل ہوئی ہو جسے انکارِ رسالت کی بنا پر عذاب قرار دیا جا سکتا ہو۔

اِن وجوہ سے یہ بات ناقابلِ قبول ہے کہ اس بستی سے مراد انطاکیہ ہے۔ بستی کا تعین نہ قرآن میں کیا گیا ہے، نہ کسی صحیح حدیث میں، بلکہ یہ بات بھی کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسول کون تھے اور کس زمانے میں بھیجے گئے تھے۔ قرآن مجید جس غرض کے لیے یہ قصہ یہاں بیان کر رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے بستی کا نام اور رسولوں کے نام معلوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قصے کے بیان کرنے کی غرض قریش کے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ تم ہٹ دھرمی، تعصب اور انکارِ حق کی اُسی روش پر چل رہے ہو جس پر اس بستی کے لوگ چلے تھے، اور اسی انجام سے دوچار ہونے کی تیاری کر رہے ہو جس سے وہ دوچار ہوئے۔

[11] دوسرے الفاظ میں ان کا کہنا یہ تھا کہ تم چونکہ انسان ہو اس لیے خدا کے بھیجے ہوئے رسول نہیں ہو سکتے۔ یہی خیال کفارِ مکہ کا بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان ہیں:

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ — وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (الفرقان: ۷)

اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے ایک — وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ

تُبْصِرُوْنَ (الانبیاء-۳) بشر کے سوا آخر اور کیا ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے اس جادو کے شکار ہو جاؤ گے؟

قرآن مجید کفارِ مکہ کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ کوئی نئی جہالت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہو، بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام جہلاء اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہو سکتا اور جو رسول ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ قومِ نوح کے سرداروں نے جب حضرت نوحؑ کی رسالت کا انکار کیا تھا تو یہی کہا تھا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ (المومنون: ۲۴) یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی فضیلت جمائے حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا ہم نے تو یہ بات کبھی اپنے باپ دادا سے نہیں سنی (کہ انسان رسول بن کر آئے)

قومِ عاد نے یہی بات حضرت ہودؑ کے متعلق کہی تھی:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۙ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (المومنون: ۳۳-۳۴) یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، کھاتا ہے وہی کچھ جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے وہی کچھ جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کر لی تو تم بڑے گھاٹے میں رہے۔

قومِ ثمود نے حضرت صالحؑ کے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ (القمر: ۲۴) کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کریں؟

اور یہی معاملہ قریب قریب تمام انبیاء کے ساتھ پیش آیا کہ کفار نے کہا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر" اور انبیاء نے ان کو جواب دیا کہ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ "واقعی ہم تمہاری طرح بشر کے سوا کچھ نہیں ہیں، مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر

پا یشلے عنایت فرماتا ہے" (ابراہیم : ۱۰-۱۱)

اس کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا رہا ہے اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی ہے:

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتْ تَّاْتِیْھِمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا۔ (التغابن : ۶)

کیا انہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا اور پھر اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور آگے ان کے لیے دردناک عذاب ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لیکر آتے رہے مگر انہوں نے کہا "کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے"؟ اسی بنا پر انہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر گئے

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل : ۹۴)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو کوئی چیز انہیں ایمان لانے سے روکنے والی اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے کہا "کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا"؟

پھر قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ، یا بشریت سے بالاتر کوئی ہستی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ وَمَا جَعَلْنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا کَانُوْا خٰلِدِیْنَ (الانبیاء : ۷-۸)

ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ جینے والے تھے

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ۔ (الفرقان : ۲۰)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

کوئی چیز نازل نہیں کی ہے [۲۲]، تم محض جھوٹ بولتے ہو۔"

رسولوں نے کہا "ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف اُسی کے بھیجے ہوئے ہیں، اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے [۲۳]۔"

بستی والے کہنے لگے "ہم تو تمہیں اپنے لیے فالِ بد سمجھتے ہیں [۲۴]۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۵)

اے نبی ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے۔

[۲۲] یہ ایک اور جہالت ہے جس میں کفارِ مکہ بھی مبتلا تھے، آج کے نام نہاد عقلیت پسند لوگ بھی مبتلا ہیں اور قدیم ترین زمانے سے ہر زمانے کے منکرینِ وحی و رسالت اس میں مبتلا رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سرے سے انسانی ہدایت کے لیے کوئی وحی نازل نہیں کرتا۔ اس کو صرف عالمِ بالا کے معاملات سے دلچسپی ہے۔ انسانوں کا معاملہ اس نے خود انسانوں ہی پر چھوڑ رکھا ہے۔

[۲۳] یعنی ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جو پیغام تم تک پہنچانے کے لیے رب العالمین نے ہمارے سپرد کیا ہے وہ تمہیں پہنچا دیں۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ مانو یا نہ مانو۔ یہ ذمہ داری ہم پر نہیں ڈالی گئی ہے کہ تمہیں زبردستی منوا کر ہی چھوڑیں۔ اور اگر تم نہ مانو گے تو تمہارے کفر میں ہم نہیں پکڑے جائیں گے بلکہ اپنے اس جرم کی جواب دہی تم کو خود ہی کرنی پڑے گی۔

[۲۴] اس سے اُن لوگوں کا مطلب یہ تھا کہ تم ہمارے لیے منحوس ہو، تم نے آکر ہمارے معبودوں کے خلاف جو باتیں کرنی شروع کی ہیں ان کی وجہ سے دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں، اور اب جو آفت بھی ہم پر نازل ہو رہی ہے وہ تمہاری بدولت ہی ہو رہی ہے۔ ٹھیک یہی باتیں کفارِ عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ "اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری بدولت ہے" (النساء: ۷۸)۔ اسی لیے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ ایسی ہی جاہلانہ باتیں قدیم زمانے کے لوگ بھی اپنے انبیاء کے متعلق کہتے رہے ہیں۔ قومِ ثمود اپنے نبی سے کہتی تھی اطَّيَّرْنَا

کردیں گے اور ہم سے تم بُری دردناک سزا پاؤ گے"۔
رسولوں نے جواب دیا "تمہاری فالِ بد تو تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے[۱۵]۔ کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو[۱۶]"۔
اتنے میں شہر کے دُور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا "اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ اُن لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں[۱۷]۔ آخر میں کیوں نہ اُس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم

بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ "ہم نے تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو منحوس پایا ہے" (النمل: ۴۷) اور یہی رویّہ فرعون کی قوم کا بھی تھا کہ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ "جب ان پر اچھی حالت آتی تو کہتے کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے، اور اگر کوئی مصیبت اُن پر آ پڑتی تو اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے" (الاعراف: ۱۳۰)

[۱۵] یعنی کوئی کسی کے لیے منحوس نہیں ہے۔ ہر شخص کا نوشتۂ تقدیر اس کی اپنی ہی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ برائی دیکھتا ہے تو اپنے نصیب کی دیکھتا ہے اور بھلائی دیکھتا ہے تو وہ بھی اس کے اپنے ہی نصیب کی ہوتی ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ "ہر شخص کا پروانۂ خیر و شر ہم نے اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے" (بنی اسرائیل: ۱۳)

[۱۶] یعنی دراصل تم بھلائی سے بھاگنا چاہتے ہو اور ہدایت کے بجائے گمراہی تمہیں پسند ہے۔ اس لیے حق اور باطل کا فیصلہ دلیل سے کرنے کے بجائے اوہام و خرافات کے سہارے یہ بہانہ بازیاں کر رہے ہو۔

[۱۷] اس ایک فقرے میں اُس بندۂ خدا نے نبوت کی صداقت کے سارے دلائل سمیٹ کر رکھ دیئے۔ ایک نبی کی صداقت دو ہی باتوں سے جانچی جا سکتی ہے۔ ایک، اس کا قول و فعل۔ دوسرے اس کا بے غرض ہونا۔ اس شخص کے استدلال کا منشا یہ تھا کہ اوّل تو یہ لوگ سراسر معقول بات کہہ رہے ہیں اور ان کی اپنی سیرت بالکل بے داغ ہے۔ دوسرے، کوئی شخص اس بات کی نشان دہی نہیں کر سکتا کہ اس دین کی دعوت یہ اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر دے رہے ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان کی بات کیوں نہ مانی جائے۔

سب کو پلٹ کر جانا ہے۱۸؟ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود بنا لوں ؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ اُن کی شفاعت میرے کسی کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۱۹۔ اگر میں ایسا کروں۲۰ تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا۲۱، تم بھی میری بات مان لو۔"

(آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ "داخل ہو جا جنت میں۲۲۔"

اس شخص کا یہ استدلال نقل کر کے قرآن مجید نے لوگوں کے سامنے ایک معیار رکھ دیا کہ نبی کی نبوت کو پرکھنا ہو تو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل بتا رہا ہے کہ وہ راہ راست پر ہیں۔ اور اُن کی سعی و جہد کے پیچھے کسی ذاتی غرض کا نام و نشان تک نہیں ہے پھر کوئی معقول انسان اُن کی بات کو رد آخر کس بنیاد پر کرے گا۔

۱۸ اس فقرے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ استدلال کا شاہکار ہے، اور دوسرے حصے میں حکمتِ تبلیغ کا کمال دکھایا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ کہتا ہے کہ خالق کی بندگی کرنا تو سراسر عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ نامعقول بات اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ آدمی اُن کی بندگی کرے جنہوں نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، نہ یہ کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ مرنا آخر تم کو بھی ہے، اور اسی خدا کی طرف جانا ہے جس کی بندگی اختیار کرنے پر تمہیں اعتراض ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اس سے مُنہ موڑ کر تم کس بھلائی کی توقع کر سکتے ہو۔

۱۹ یعنی نہ وہ خدا کے ایسے چہیتے ہیں کہ میں صریح جرم کروں اور وہ محض اُن کی سفارش پر مجھے معاف کر دے۔ اور نہ ان کے اندر اتنا زور ہے کہ خدا مجھے سزا دینا چاہے اور وہ اپنے بل بوتے پر مجھے چھڑا لے جائیں۔

۲۰ یعنی یہ جانتے ہوئے بھی اگر میں ان کو معبود بناؤں۔

۲۱ اس فقرے میں پھر حکمتِ تبلیغ کا ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ یہ کہہ کر اُس شخص نے اُن لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ جس رب پر میں ایمان لایا ہوں وہ محض میرا ہی رب نہیں ہے بلکہ تمہارا رب

اُس نے کہا "کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے ربّ نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا"۔[۲۳]

اس کے بعد اُس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اُتارا۔ ہمیں اس کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس ایک دھماکا ہُوا اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے۔[۲۴] افسوس بندوں کے حال پر،

بھی ہے۔ اس پر ایمان لا کر مَیں نے غلطی نہیں کی ہے بلکہ اس پر ایمان نہ لا کر تم ہی غلطی کر رہے ہو۔

[۲۲] یعنی شہادت نصیب ہوتے ہی اس شخص کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ جونہی کہ وہ موت کے دروازے سے گزر کر دوسرے عالم میں پہنچا، فرشتے اس کے استقبال کو موجود تھے اور انہوں نے اسے خوشخبری دے دی کہ فردوسِ بریں اس کی منتظر ہے۔ اس فقرے کی تاویل میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ قَتَادہ کہتے ہیں کہ "اللہ نے اسی وقت اسے جنت میں داخل کر دیا اور وہ وہاں زندہ ہے، رزق پا رہا ہے"۔ اور مجاہد کہتے ہیں کہ "یہ بات ملائکہ نے اس سے بشارت کے طور پر کہی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد جب تمام اہل ایمان جنت میں داخل ہوں گے تو وہ بھی اُن کے ساتھ داخل ہوگا"۔

[۲۳] یہ اُس مردِ مومن کے کمالِ اخلاق کا ایک نمونہ ہے۔ جن لوگوں نے اسے ابھی ابھی قتل کیا تھا ان کے خلاف کوئی غصہ اور جذبۂ انتقام اس کے دل میں نہ تھا کہ وہ اللہ سے ان کے حق میں بد دعا کرتا۔ اس کے بجائے وہ اب بھی ان کی خیر خواہی کیے جا رہا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے دل میں اگر کوئی تمنا پیدا ہوئی تو وہ بس یہ تھی کہ کاش میری قوم میرے اس انجامِ نیک سے باخبر ہو جائے اور میری زندگی سے نہیں تو میری موت ہی سے سبق لے کر راہِ راست اختیار کرلے۔ وہ شریف انسان اپنے قاتلوں کے لیے بھی جہنم نہ چاہتا تھا بلکہ یہ چاہتا تھا کہ وہ ایمان لا کر جنت کے مستحق بنیں۔ اسی کی تعریف کرتے ہوئے حدیث میں ارشاد ہُوا ہے کہ نصح قومه حیّا ومیّتا "اس شخص نے جیتے جی بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور مر کر بھی"۔

اس واقعہ کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو در پردہ اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے کہ

جو رسول بھی ان کے پاس آیا اُس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے؟[۲۵]
ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے ؏

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان بھی اُسی طرح تمہارے سچے خیر خواہ ہیں جس طرح وہ مردِ مومن اپنی قوم کا خیر خواہ تھا۔ یہ لوگ تمہاری تمام ایذا رسانیوں کے باوجود تمہارے خلاف کوئی ذاتی عناد اور کوئی جذبۂ انتقام نہیں رکھتے۔ ان کو دشمنی تم سے نہیں بلکہ تمہاری گمراہی سے ہے۔ یہ تم سے صرف اس لیے لڑ رہے ہیں کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

یہ آیت بھی منجملہ اُن آیات کے ہے جن سے حیاتِ برزخ کا صریح ثبوت ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ خالص عدم اور کامل نیستی کا زمانہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ اس زمانہ میں جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی اور کلام سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے، اور اہلِ دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مرنے کے بعد اس مردِ مومن کو جنت کی بشارت کیسے دی جاتی اور وہ اپنی قوم کے لیے یہ تمنا کیسے کرتا کہ کاش وہ اس کے انجامِ نیک سے باخبر ہو جائے۔

[۲۴] ان الفاظ میں ایک لطیف طنز ہے۔ اپنی طاقت پر اُن کا گھمنڈ اور دینِ حق کے خلاف ان کا جوش و خروش گویا ایک شعلہ جوالہ تھا جس کے متعلق اپنے زعم میں وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ان تینوں انبیاءؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کو بھسم کر ڈالے گا لیکن اس شعلے کی بساط اس سے زیادہ کچھ نہ نکلی کہ خدا کے عذاب کی ایک ہی چوٹ نے اس کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔

[۲۵] یعنی ایسے مٹے کہ ان کا کہیں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ جو گرا پھر نہ اُٹھا۔ دنیا میں آج کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں ہے۔ ان کی تہذیب اور ان کے تمدن ہی کا نہیں، ان کی نسلوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

ترکی کے مردِ مجاہد

بدیع الزماں کی شخصیت و دعوت

ترکی کی اسلامی تحریک اور الحاد و دین کی کشمکش کی داستان

تصنیف: محمد سعید رمضان البوطی — ترجمہ: خلیل حامدی

[ذیل کے صفحات میں ترکی کے مجاہد اعظم بدیع الزمان نورسی کے حالاتِ زندگی اور شخصیت و دعوت کا ایک طائرانہ خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کی تحریکِ الحاد کے مقابلے میں بدیع الزمان نورسی نے جو دینی خدمات سرانجام دی ہیں اُن سے باہر کے لوگ اکثر و بیشتر ناواقف ہیں۔ اس طویل مضمون کو ترجمان القرآن کے صفحات میں نقل کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کا اسلام پسند طبقہ ترکی میں احیاءِ اسلام کی کوششوں سے واقف ہونے کے ساتھ ترکی کے مردِ مجاہد کے کارناموں سے سوز دروں بھی حاصل کرے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون داعیانِ حق کے اندر دین کی محبت، ایمان کی حرارت اور دعوت کے جذبہ و شوق میں اضافہ کرے گا۔ یہ مضمون شام کے نامور رسالہ "حضارۃ الاسلام" سے لیا گیا ہے۔ خ۔ ح]

اگر علمائے اسلام کے تصور کے بموجب سنتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اندر مختلف وقفوں کے بعد ایسی ہستیاں وجود میں آتی رہیں جو دینِ حق کی تجدید کا فرض انجام دیں اور مسلمانوں کے اندر جہاد اور اقامتِ دین کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیں تو بلاشبہ اس تصور کی رُو سے بدیع الزمان نورسی ایک مجدد تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ترکی میں کمال اتاترک کے عہد میں امتِ مُسلمہ کو عطا فرمایا تھا۔ بدیع الزمان اتاترک کے مقابلے میں اسلامی جہاد کے نقیب تھے اور ان کی ذات اُن لاکھوں مسلم نوجوانوں کے لیے مرکز و محور بنی رہی جنہوں نے کمالی استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اتاترک مصطفیٰ کمال مدت ہوئی مر چکا مگر بدیع الزمان کے پیروؤں کی تعداد تا ایں دم دن دگنی اور رات چوگنی بڑھ رہی ہے۔

تقریباً ۳ سال قبل جب بدیع الزمان کا انتقال ہوا ہے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ ان کے پیرو ترکی کے گوشے گوشے سے حکومت کے دروازوں کو کھٹکھٹا رہے تھے۔ مگر امریکہ نے بڑھ کر فوراً حالات پر قابو پالیا اور ملکی فضا کا پانسہ یکسر بدل کر نظامِ حکومت از سرِ نو کمالی گروہ کے ہاتھ میں دینے کے پختہ انتظامات کر دیئے۔ لیکن اس سازش کے باوجود بدیع الزمان کے پیرو اور ان کے وفا شعار شاگرد تاہنوز اسلامی انقلاب کے لیے اپنی قوتوں کو جمع کرنے میں مصروف ہیں اور اس مقصدِ اعلیٰ و ارفع کے لیے وہ تعلیم و صحافت کے میدان میں کام کر رہے ہیں اور فوجی تربیت کے اصول و ضوابط میں دستگاہ حاصل کر رہے ہیں۔

پیدائش اور زندگی کے ابتدائی حالات

بدیع الزمان نورسی ۱۸۷۳ء (۱۲۹۳ھ) میں صوبہ بدلیس کے ضلع ہیزان میں ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین کردی الاصل تھے۔ ۹ سال کی عمر میں آپ نے اپنے بڑے بھائی مُلا عبداللہ کی ترغیب سے حصولِ علم کی طرف توجہ کی۔ اور اردگرد کے متعدد مدارس میں علم کی تلاش میں سفر کیے۔ ۱۸ برس کو پہنچے ہی تھے کہ آپ کا شمار اکابر علماء میں ہونے لگا۔ اس مختصر سے عرصہ میں آپ کو علومِ لغت، علومِ عقلیہ، علومِ قرآن اور اصولِ فقہ میں پوری دستگاہ حاصل ہوگئی۔ اور اہلِ وطن پر آپ کے بے پناہ حافظے اور حیرت انگیز فہم کا انکشاف ہوا۔ آپ کو مقاماتِ حریری کامل حفظ تھی، المحیط (ڈکشنری)، کو حرفِ سین تک یاد کر رکھا تھا۔ اصولِ فقہ کی مشہور کتاب جمع الجوامع ایک ماہ کے اندر دماغ میں اتار لی تھی۔ علماء اور طلبہ کی مجلسوں میں آپ کا عام چرچا ہونے لگا اور وہ آپ کو "سعیدی مشہور" کے لقب سے پکارنے لگے۔

آپ کی علمی شہرت اور بے پناہ صلاحیت نے اہلِ علم کی کثیر تعداد کے دلوں میں حسد اور رقابت کے جذبات مشتعل کر دیئے اور وہ آپ کو طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالنے لگے اور آپ کے خلاف حکام اور امراء کے کان بھرنے لگے۔ لیکن آپ کی علمی وسعت اور آپ کا انتہائی خاکسارانہ مزاج ہر موقع پر آپ کو ان کے منصوبوں اور سازشوں سے بچاتا رہا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ آپ کو اذیت دینے کی اسکیم بنا کر آئے۔ آپ ان کے ارادہ کو فوراً بھانپ گئے اور کہا: "مجھے بے شک مار ڈالیں... لیکن میری درخواست ہے کہ علم کے مرتبہ و منصب کو ذلیل نہ کریں" صوبہ سعرت کا والی آپ کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے جب اس

واقعہ کو سنا تو ایسے بدخواہوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا مگر بدیع الزمان نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور والی سے کہا: ہم لوگ طالب علم ہیں، آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں اور رضامند بھی ہو جاتے ہیں، میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ان کے معاملات میں وہ شخص دخل دے جو ان میں سے نہیں ہے۔ نیز اس قضیے میں قصور میرا تھا" بدیع الزمان کے یہ الفاظ جب زبان سے نکل رہے تھے تو اس وقت موصوف کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔

سعید نورسی نے اپنی زندگی کا آغاز زہد و تقشّف اور فلسفہ و حکمت میں انہماک سے کیا۔ یہ راستہ جسے موصوف نے آغازِ شباب ہی میں منتخب کر لیا تھا اس امر کی دلیل ہے کہ موصوف کا مزاج اور ذہن دونوں ان باتوں سے مبرّا تھے جو عام طور پر دورِ شباب میں ہر انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اور یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ ان کے فہم و فکر اور ذوق و طبع پر شروع ہی سے کچھ دوسرے اہم امور و مسائل چھائے ہوئے تھے۔

موصوف نے ایامِ شباب ہی سے اس حدیثِ نبویؐ کو دستورِ حیات بنا رکھا تھا کہ "دَعْ مَا یریبك الی ما لا یریبك (مشتبہ بات کو چھوڑ کر، وہ بات اختیار کرو جس میں کوئی شبہ نہ ہو)۔ اس طرزِ عمل نے زندگی کے تمام معاملات میں موصوف کو انتہائی متورّع اور محتاط بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اگر انہیں ایسی خوراک میسر نہ آتی جو ہر شک و شبہ سے پاک ہو تو وہ گھاس اور سبزیوں سے شکم پُری کر لیتے۔ موصوف کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے کھانے میں سے مزور کچھ نہ کچھ چیونٹیوں کے لیے چھوڑ دیتے۔ ایک مرتبہ جب اُن سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو کہنے لگے: "یہ میں اِس مخلوق کی حیرت انگیز تنظیم اور اس کی عجیب و غریب جمہوریت پسندی کا صلہ دیا کرتا ہوں"۔ موصوف مشہور کُرد شاعر شیخ احمد خانی کی قبر کے پاس طولِ اقامت اور خلوت گزینی کے بڑے دلدادہ تھے۔ قبر کے نواح کی تاریکی اور وحشت کے باوجود وہ گھنٹوں وہاں محوِ استغراق رہتے۔

شجاعت و حق گوئی اس تقشّف پسندی کے ساتھ ساتھ موصوف جسمانی طور پر بھی بڑے قوی ہیکل اور شہ زور تھے مختلف ہتھیاروں کے استعمال کے شائق تھے، نشانہ بازی اور گھڑ سواری محبوب مشغلہ تھا اور آپ نہایت اعلیٰ فوجی اسپرٹ سے بہرہ مند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حیرت انگیز شجاعت سے

نواز رکھا تھا۔ چنانچہ کم سنی کے باوجود آپ کسی مخلوق کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایام جوانی میں قبیلہ میراں کے سردار کے پاس گئے۔ سردار کا نام مصطفیٰ پاشا تھا۔ اور وہ بڑا ستمگر اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرنے میں دلیر تھا۔ پاشا نے جب آپ کو دیکھا تو فوراً بول اٹھا: "یہاں کیسے آیا ہے؟" بدیع الزمان نے بلا خوف و خطر جواب دیا: "تیری ہدایت کے لیے آیا ہوں۔ یا تو تُو حق بات سن اور اُس کی اطاعت کر اور یا پھر میں تیرا کام تمام کر دوں گا۔" پاشا کی مارے غصہ کے رگیں پھول گئیں اور بدیع الزمان کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر کہنے لگا: "اس ردّی تلوار سے تو مجھے قتل کرے گا؟" بدیع الزمان نے کہا: "کاٹنے والی تلوار نہیں ہوگی، کاٹنے والا میرا ہاتھ ہوگا۔" پاشا نے غضبناک ہو کر کہا: "اس جزیرے کے اندر میرے پاس علماء کا گروہِ کثیر رہتا ہے۔ اگر تو اپنی رائے اُن سے منوا لے تو میں تیری باتوں کو تسلیم کر لوں گا ورنہ میں تجھے دریائے فرات کی نذر کر دوں گا۔" بدیع الزمان نے جواب دیا: "یہ میری ذمہ داری نہیں کہ میں تمام علماء کو اپنی کسی رائے کا پابند کر سکوں۔ اور نہ تیری یہ شرط درست ہے کہ اگر وہ تسلیم نہ کریں تو مجھے دریا میں پھینک دیا جائے۔ البتہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر میں نے علماء کے سوالوں کا صحیح جواب دے دیا تو اس کے صلہ میں تُو اپنی بندوق میرے حوالے کر دے۔ پھر اگر تو نے میری نصیحت نہ قبول کی تو اُسی بندوق سے تیری خبر لے ڈالی جائے گی۔"

مصطفیٰ پاشا نے تمام علماء کو جمع کیا۔ باہم بحث و مذاکرہ ہوا اور آخر کار میدان بدیع الزمان کے ہاتھ رہا۔ پاشا نے بدیع الزمان کے علم و بصیرت اور حق پرستی کو دیکھ کر توبہ کی اور ان کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

سیاسی زندگی کا آغاز سعید نورسی نے سیاسی زندگی کا آغاز ۲۰ سال کی عمر میں کیا۔ اور صوبہ ماردین میں پہلی مرتبہ اس میدان میں اُترے جہاں موصوف نے ملکی معاملات کے بارے میں حکومت پر پوری صراحت و جرأت کے ساتھ تنقید کی۔ ماردین کے گورنر نے جب آپ کی بے باک طبیعت اور تند و تیز تنقید کو دیکھا تو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر موصوف کو بدلیس میں جلاوطن کر دیا۔ وہاں پہنچے تو تھوڑے سے ہی عرصہ کے بعد بدلیس کے حاکم اور بدیع الزمان کے درمیان انتہائی دوستانہ تعلقات

استوار ہو گئے اور موصوف بدلیس میں جلاوطنی کی تکلیفوں کے بجائے بڑے آبرومندانہ طریقے سے رہنے لگے۔

بدیع الزمان نے اوائلِ حیات ہی میں طبیعیاتی علوم کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کر لیا چنانچہ تمام مصروفیتوں کے ہجوم میں آپ نے پورے انہماک و مشقت کے ساتھ ان علوم کا مطالعہ شروع کیا اور مختصر عرصہ کے اندر تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، جیولوجی اور قدیم اور جدید فلسفہ اور بعض غیر ملکی زبانوں کے اندر مہارت حاصل کر لی۔ موصوف کا یہ بے مثال کمال ملک بھر کے اخبارات و رسائل تک شہرت پکڑ گیا اور اس کا عام چرچا ہونے لگا۔ اس کے بعد ملک بھر کے علماء نے آپ کو بالاتفاق "بدیع الزمان" کا لقب دیا۔

سیاسی ذوق کی بنا پر آپ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت پابندی سے اخبارات کا مطالعہ کرتے۔ ایک روز آپ نے یہ خبر پڑھی کہ برطانیہ کے وزیرِ نوآبادیات نے ایک خصوصی میٹنگ میں یہ کہا ہے کہ: "جب تک مسلمانوں کے پاس قرآن موجود ہے، وہ ہمارے راستہ میں روڑے اٹکاتا رہے گا اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کتاب کو مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کیا جائے۔" اس خبر کو پڑھ کر بدیع الزمان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور موصوف نے اُسی وقت اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ برطانوی وزیر کے ناپاک ارادوں کے علی الرغم میں اپنی تمام زندگی قرآن کی خدمت اور اس کے اعجاز اور اسرار بیان کرنے میں صرف کروں گا۔

اس اعلان کے بعد موصوف نے استنبول کا قصد کیا اور وہاں "زہراء" کے نام سے جامع ازہر کے پایہ کی ایک درسگاہ کی داغ بیل ڈالنے کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔ موصوف نے استنبول میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہاں کے اخبارات نے آپ کی آمد کا چرچا شروع کر دیا۔ ایک اخبار نے لکھا: "استنبول کے افق پر ایک ایسے انسان کا طلوع ہوا ہے جو فہم و ذکا کا شعلۂ جوالہ ہے۔"

شیخ الازہر سے ملاقات | اتفاق کی بات ہے کہ انہی ایام میں ازہر کے ریکٹر شیخ بخیت سیاحت و تفریح کی غرض سے استنبول وارد ہوئے۔ بدیع الزمان کے ساتھ اُن کی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور دونوں کے

درمیان متعدد مجالس میں مختلف مسائل پر طویل گفتگوئیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ شیخ بخیت نے بدیع الزمان سے سوال کیا: "خلافتِ عثمانیہ اور یورپی اقوام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

بدیع الزمان نے عربی زبان میں جواب دیا:

"یورپ کو آج اسلام کا حمل ٹھیر چکا ہے، کسی روز وہ اسے جنے گا اور خلافتِ عثمانیہ کو تہذیبِ یورپ کا حمل ٹھیر چکا ہے۔ کسی روز اُسے جنے گی۔"

شیخ بخیت بڑی حیرت سے بولے کہ ایسے نوجوان کے ساتھ بحث و مناظرہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا مختصر، بلیغ اور صحیح جواب بدیع الزمان جیسا شخص ہی دے سکتا ہے۔

انجمن اتحاد و ترقی سے جنگ ۱۹۰۸ء میں محمد شاد کی تحریکِ حریت اور انجمن اتحاد و ترقی وجود میں آئی۔ اس تحریک نے بظاہر دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا مگر بباطن وہ یہودیت اور فری میسن کی خباثت سے پُر تھی۔ بدیع الزمان نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر بلا تاخیر اس کے مقابلے میں "اتحادِ محمدی" کے نام سے ایک اسلامی جماعت کی داغ بیل ڈال دی۔ اتحاد محمدی کو تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر فروغ ہوا کہ آن کی آن میں دولتِ عثمانیہ کے اطراف و دیار سے ہزاروں لوگ اس میں شامل ہو گئے۔

بدیع الزمان نے انجمن اتحاد و ترقی کے مقابلہ کے لیے جو طریق کار اختیار کیا ہے اُس میں موصوف کی سیاسی بصیرت و تدبر اور معاملہ فہمی کی قوت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ موصوف نے دیکھا کہ انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈروں کے ساتھ کھلم کھلا جنگ مفید و موثر نہیں رہے گی، کیونکہ سادہ لوح مسلمان اور مشایخ کا ایک گروہ اتحادیوں کے ظاہری لبادے اور دینداری کے فریب میں آچکا ہے۔ اس لیے نفاق پرست انجمن سے علی الاعلان برسرِ پیکار ہوجانے کو سادہ لوح لوگ اسلام کے ساتھ جنگ سمجھیں گے۔ چنانچہ بدیع الزمان نے اتحادِ محمدی کا بھی وہی نظریہ قرار دیا جسے اتحادیوں نے اختیار کر رکھا تھا، یعنی حریت و استقلال۔ مگر ساتھ ساتھ اس اضافے پر بھی اصرار شروع کر دیا کہ یہ حریت اسلامی قانون اور اسلام کے اصول و عقیدہ کے تحت ہونی چاہیے۔ اس کے بعد موصوف برابر پوری قوت و جرأت کے ساتھ اپنے مسلک کی تائید میں انقلاب انگیز مضامین شائع کرتے رہے۔ موصوف تنبیہ و انذار کے

لہجے میں برملا کہا کرتے تھے "اگر ہم نے اس حریت کو اختیار نہ کیا جس کا راستہ اسلام نے تجویز کیا ہے تو استبداد اور استعباد (غلامی) کی دو بڑی بلائیں ہم پر مسلط ہو جائیں گی اور ہم بہت جلد خود حریت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔" ان حالات میں جب کہ اتحادی لیڈر بدیع الزمان پر کسی الزام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے، کیونکہ بدیع الزمان بھی اُن کے نعرہ و مقصد کے ہمنوا تھے، بدیع الزمان نے کام کا جو اسلوب اختیار کیا، درحقیقت وہی ایک ایسا راستہ ہو سکتا تھا جس کے ذریعے وہ لوگوں کو اُس خطرے سے آگاہ کر سکتے تھے جو اتحادی لیڈروں کے دماغ میں پل رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بدیع الزماں اپنے نعرہ و مقصد سے علی الفور ملک میں ایک اسلامی محاذ کی تشکیل کرنا چاہتے تھے اور اتحادی لیڈر اپنی دینداری کو اسلام کی قوت کو شل کرنے کے لیے اور اسلام کے بجائے تورانی قومیت کو قائم کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

بدیع الزماں کی دعوت نے فری میسن کے حلقوں میں ہلچل ڈال دی کیونکہ یہی لوگ درحقیقت اتحادی تحریک کے پشت پناہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صدر قرصو کو جو بہت بڑا یہودی سرمایہ دار تھا بدیع الزماں کے پاس تبادلۂ خیالات کے لیے بھیجا لیکن یہ شخص بدیع الزمان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آگیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: "یہ عجیب و غریب شخص تو اپنی باتوں سے مجھے اسلام کی طرف لے چلا تھا۔" قرصو وہ پہلا یہودی سرمایہ دار ہے جس نے خلافتِ عثمانیہ کو زیر و زبر کرنے اور سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے اور فلسطین کو غصب کرنے کے لیے تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

بدیع الزمان پر پہلا مقدمہ: اتحادی لیڈروں کو بدیع الزمان کی دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ بدیع الزمان پر ہاتھ ڈالیں۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۰۹ء کو ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس کی آڑ میں بدیع الزماں اور دوسرے متعدد مسلمان گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں سے ۱۹ مسلمانوں کو پھانسی دی گئی۔ اور بدیع الزماں کو بھی ہراساں اور خوف زدہ کرنے کے لیے اُسی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے ان ۱۹ افراد کو موت کی سزا دی تھی۔ دورانِ مقدمہ عدالت کے صدر خورشید پاشا نے ۱۵ آدمیوں کو موت کا فیصلہ سنانے کے بعد بدیع الزماں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: کیا آپ بھی اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں؟ اور اس کے بعد بدیع الزماں سے مطالبہ کیا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔

بدیع الزمان اٹھے اور انہوں نے عدالت کے روبرو ایک پُراثر تقریر کی۔ اگر صفحات کی تنگی حارج نہ ہوتی تو ہم قارئین کے سامنے پوری تقریر نقل کر دیتے تاہم اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"اگر میری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں انہیں اسلام کے لامتناہی حقائق میں سے ایک حقیقت پر بھی قربان کر دینے میں پس و پیش نہ کرتا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تو ایک طالبِ حق ہوں۔ میں ہر چیز کو شریعت کی میزان میں تولوں گا۔ میں ایسی کسی بات کو تسلیم نہیں کروں گا جو اسلام سے خارج ہو۔ میں اس وقت اس برزخ کے سامنے، جسے تم لوگ جیل کہتے ہو، کھڑا ہوں اور اس گاڑی کے انتظار میں ہوں جو مجھے آخرت کی جانب لے جاتے۔ اور میں جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہوں یہ اس لیے نہیں کہ صرف تم اسے سن لو بلکہ اس لیے کہ یہ تمام دنیا کے علم میں آجاتے۔"

"وقت آگیا ہے کہ اسرار منکشف ہو جائیں اور دل کی گہرائیوں سے باہر آجائیں پس جو غیر محرم ہے وہ ان کی طرف نہ دیکھے۔"

"میں سفرِ آخرت کے لیے پورے شوق کے ساتھ تیار کھڑا ہوں۔ اور ان لوگوں کی معیت کے لیے حاضر ہوں جو سولی پر چڑھائے جا چکے ہیں۔ تم اس بدوی کا تصور کرو جسے استنبول کی باتیں سن سن کر استنبول دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اس بدوی کی طرح آخرت میں پہنچنے کا شوق ہے۔ تم لوگوں کا مجھے جگہ جگہ جلاوطن کر دینا کوئی سزا نہیں ہے۔ اگر تمہارے اندر استطاعت ہے تو میرے اونچا کر سزا دو۔"

"حکومت عہدِ استبداد میں عقل کی دشمن تھی اور اب زندگی کی دشمن ہے۔ اگر حکومت کا یہی رنگ ڈھنگ رہا تو پھر اسے جنون زندہ باد، اسے موت زندہ باد، اور ظالموں کے لیے جہنم زندہ باد۔"

"تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا تو "اتحاد محمدیؐ" میں شامل ہے؟ میں کہتا ہوں "ہاں مجھے فخر ہے کہ میں اس کا ایک حقیر فرد ہوں۔ لیکن کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ پاگلوں اور بیوقوفوں کے

سوا کون لوگ الحادِ محمدی سے باہر ہیں ؟ "

"میرا دوسرا جرم یہ ہے کہ میں نے الحاد اور ماسونیت کے علمبردار اخبار نویسوں پر تنقید کی ہے اور ان کا جواب دینے کی جرأت کی ہے ۔ اور ان کو بتایا ہے کہ ادیب کو اپنی دعوت میں بھی ادیب ہونا چاہیے ۔ خاص طور پر جب کہ اُسے قوم کے کان اور قوم کی زبان ہونے کی حیثیت حاصل ہو ۔ اور میں اب کہتا ہوں کہ جس طرح ایک باوقار بوڑھے کو بچیوں کا لباس زیب نہیں دیتا اسی طرح استنبول کو یورپ کے اخلاق اور یورپ کی بود و باش زیب نہیں دیتی ۔"

اخبارات نے ہاتھوں ہاتھ بدیع الزمان کے اس بیان کو لیا جو دس فل اسکیپ سے زائد تھا ۔ اور ہر حلقے میں اسے پڑھا جانے لگا ۔ ہزاروں مسلمان جن میں بدیع الزمان کے پیرو بھی تھے اور دوسرے بھی عدالت کی عمارت کے ارد گرد جمع ہو گئے ۔ اور برابر یہ نعرے لگانے لگے : " ظالموں کے لیے جہنم زندہ باد ! اور تخریب پسند اور وطن دشمن مردہ باد ! " نتیجہ یہ ہوا کہ اس مردِ مجاہد کو کچھ مدت کے لیے حوالۂ زنداں کر دیا گیا ۔ مگر بعد میں بہت جلد ان کی رہائی عمل میں آگئی ۔ اس کے بعد بدیع الزماں زیادہ دیر تک استنبول میں اقامت پذیر رہے ، بلکہ وآن چلے گئے اور تعلیم و تدریس ، وعظ و ارشاد اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے ۔

فوج میں رضاکارانہ شمولیت | جب پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا تو بدیع الزماں رضاکارانہ طور پر فوج میں شامل ہو گئے اور اونچے فوجی عہدہ پر متعین ہوئے ۔ آپ کا معمول تھا کہ ایام جنگ میں شام کے وقت اپنے کیمپ میں واپس آجاتے ۔ آپ کے اردگرد طلبہ کا مجمع لگ جاتا اور آپ قرآن کریم کا درس دیتے ۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ موصوف نے انہی ایام میں اپنی بہترین کتاب " اشارۃ الاعجاز " تالیف کی ہے ۔ موصوف کی عربی زبان میں یہ پہلی تصنیف ہے ۔

روسی فوجیوں کے ہاتھ میں گرفتاری | دورانِ جنگ میں بدیع الزمان روسی فوجوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے ۔ آپ قیدیوں کے کیمپ میں تھے کہ ایک روز ایک روسی کمانڈر کیمپ میں داخل ہوا ۔ اُسے دیکھ کر

تمام قیدی کھڑے ہو گئے مگر بدیع الزمان نے اس کی طرف نگاہ تک نہ اٹھائی۔ کمانڈر نے موصوف کی جانب دیکھ کر کہا: "شاید تم مجھے نہیں پہچانتے"۔ بدیع الزمان نے جواب دیا: "میں پہچانتا ہوں تمہیں نکوس کہا جاتا ہے"۔ کمانڈر نے کہا: "اگر تم نے جانتے بوجھتے یہ حرکت کی ہے تو تم نے عظمت روس کی توہین کی ہے!" بدیع الزمان نے کہا: "یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ جس خدا پر میرا ایمان ہے اُس کا فیصلہ ہے کہ اہلِ ایمان دوسروں سے برتر ہوں۔ اور یہی چیز میرے قیام میں مانع ہے"۔ اس گستاخی کی پاداش میں بدیع الزمان کو ملٹری کورٹ کی طرف سے موت کی سزا سنائی گئی۔ اور جب آپ کو پھانسی کے تختہ پر لے جایا گیا تو یکایک وہی کمانڈر آگے بڑھا اور آپ سے کہنے لگا: "میں تیرے اس دین کا احترام کرتا ہوں جس نے تجھے اس حد تک خوددار بنا دیا ہے۔ اور آپ کی سزا معاف کر دی۔

ایامِ اسیری میں آپ کو سائبیریا منتقل کر دیا گیا۔ جہاں آپ طویل عرصہ تک رہے اور سخت سردی کی اذیتیں جھیلتے رہے۔ لیکن حسنِ اتفاق کہ آپ سائبیریا سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور بڑے کٹھن سفر کے بعد جرمنی، ویانا اور بلغاریہ ہوتے ہوئے استنبول پہنچے۔

انگریزوں سے جھڑپ | پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد ۱۹۱۸ء میں استنبول پر انگریزوں نے تسلط قائم کر لیا۔ چنانچہ انگریزوں نے . . . . . . اسلام کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع کرنے کی خاطر انگلیکن چرچ کی وساطت سے ترکی کے شیخ الاسلام کی طرف ۶ سوالات بھیجے۔ شیخ الاسلام نے یہ چھ سوال بدیع الزمان کی طرف بھیج دیئے اور انگریزوں کے مطالبہ کے مطابق ۶ سو الفاظ میں ان کا جواب دینے کی درخواست کی۔ بدیع الزمان نے جواب میں یہ لکھ بھیجا کہ "ان سوالات کا ۶ سو الفاظ میں یا ۶ الفاظ میں یا ایک لفظ میں جواب نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ سوال کرنے والوں کے منہ پر ایک ہی مرتبہ تھوک دینا ان کا واحد جواب ہے"۔ انگریز اس جواب پر بھڑک اٹھے اور آپ کو موت کی سزا سنائی گئی جو بعد میں اناضول کے ہنگاموں کی وجہ سے منسوخ کر دی گئی۔

بدیع الزمان اور مصطفیٰ کمال میں اختلافات کا آغاز | جب اناضول کی بغاوت کامیاب ہو گئی تو مصطفیٰ کمال نے جو بغاوت کی تحریک کا سربراہ تھا، ۱۹۲۰ء میں بدیع الزمان کو اعزاز و تکریم کے ساتھ

انقرہ بلوایا۔ اور جشنِ آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ بدیع الزمان جب انقرہ پہنچے تو یکایک ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور انہوں نے مصطفیٰ کمال کے اندر اسلامی شریعت کے خلاف عداوت و بغض کو صاف محسوس کرلیا چنانچہ جشنِ آزادی میں مصطفیٰ کمال نے جس تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا موصوف نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ بلکہ چند ہی روز بعد انقرہ سے واپس چلے گئے اور ایک طویل بیان پارلیمنٹ کے نمائندوں کے نام بھیجا۔ پارلیمنٹ کا صدر خود مصطفیٰ کمال تھا۔ اس بیان میں بدیع الزمان نے دس نکات پر مشتمل ہدایات و نصائح ایوان کے ممبروں کو تلقین کیں۔ اور بیان کی پیشانی پر یہ جملہ درج کیا: اعلموا ایھا المبعوثون انکم مبعوثون لیوم عظیم "پارلیمنٹ کے ممبرو! یاد رکھو ایک دن تمہیں خدا کے حضور حاضر ہونا ہے" اسمبلی میں اس بیان کو کاظم قرہ بکر نے پڑھ کر سنایا۔ اور اس کا اس قدر اثر ہوا کہ پارلیمنٹ کے ۶۰ ارکان نے اسی وقت دین کا راستہ اختیار کرنے اور نماز قائم کرنے کا عہد کیا۔ اس صورتِ حال سے مصطفیٰ کمال کے غرورِ نفس کو ٹھیس لگی۔ چنانچہ اس نے منافقانہ طور پر بدیع الزمان کو اپنے پاس بلایا اور انہیں ایوانِ نمائندگان میں لے گیا۔ دورانِ بحث مصطفیٰ کمال نے بدیع الزمان سے کہا: "بلاشبہ ہم آپ جیسے لائق استاد کے محتاج ہیں۔ ہم نے آپ کے بہترین خیالات سے استفادہ کے لیے آپ کو یہاں بلایا تھا لیکن آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نماز کی بات چھیڑ دی۔ اور اس طرح آپ نے ابتدا ہی میں اس ایوان کے اندر تفرقہ اندازی شروع کردی" بدیع الزمان نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پُرجوش لہجے میں مصطفیٰ کمال کو جواب دیا: "پاشا صاحب، دعوائے اسلام کے بعد سب سے پہلے جو علامت ایک مسلمان کی زندگی میں نمایاں ہوتی ہے وہ نماز ہے۔ جو نماز نہیں پڑھتا وہ باغی ہے اور باغی کی حکومت ناقابلِ تسلیم ہے" یہ جواب سن کر مصطفیٰ کمال کو نزاکتِ حالات دیکھ کر معافی مانگنی پڑی اور اس بحث کو ختم کرنا پڑا۔

مصطفیٰ کمال کی الحاد پسندی کے باوجود بدیع الزمان کو یہ توقع تھی کہ شاید کمالی حکومت کی تاریکیوں کے اندر سے وہ روشنی کی کوئی کرن پیدا کرسکیں اور حکومت کی کوششوں کا رُخ اسلام کی خدمت کی جانب پھیر سکیں لیکن ان کی یہ توقعات روز بروز ماند ہوتی گئیں اور اسلام کے احیاء کے راستہ میں کانٹوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوتا رہا۔

مصطفیٰ کمال کی نوازشیں | بدیع الزمان مصطفیٰ کمال کو نصیحت کرنے اور انہیں جادۂ اسلام سے انحراف کے نتائج بد سے خوف دلانے کے ہر موقع کو نگاہ میں رکھتے رہے۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے نشۂ اقتدار میں اُن کی کسی بات کو قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ البتہ مصطفیٰ کمال نے ملک کے اندر بدیع الزمان کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے اپنے قلبی بغض و عناد کے باوجود اُن کے دل کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی۔ آپ کو اناضول کے پورے مشرقی علاقے کا رئیس المبلغین بنا دیا۔ جامعہ دار الحکمت کی صدارتی کونسل کا ممبر مقرر کر دیا، اور رہائش کے لیے ایک عظیم الشان کوٹھی پیش کی اور ہر تدبیر سے انہیں اپنا مقرب بنانے کی کوشش کی۔ مگر بدیع الزمان نے، جو مصطفیٰ کمال کی ان تمام نوازشوں کا اصل مدعا سمجھتے تھے، ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کیا۔ بلکہ آپ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انقرہ کو چھوڑ کر وان چلے گئے۔ اور آپ نے ارکانِ پارلیمنٹ کی ان تمام درخواستوں کو رد کر دیا جس میں انہوں نے آپ کو انقرہ ترک نہ کرنے پر زور دیا تھا۔ وان جا کر آپ نے حکام اور عامۃ الناس سے الگ تھلگ ایک گوشہ میں ڈیرے ڈال دیئے۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔

بدیع الزمان کے کام کا دوسرا دور | یہی تاریخ بدیع الزمان کی زندگی کے دو مختلف و متمایز مرحلوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار پا گئی۔ اس کے بعد موصوف اس تاریخ کے مرحلۂ ماقبل کے سعید کو "سعید قدیم" اور مرحلۂ مابعد کے سعید کو "سعید جدید" کے نام سے پکارتے تھے۔ سعید جدید سعید قدیم سے بیشتر امور میں اختلاف رکھتا ہے۔ جن میں سے نمایاں اختلاف سیاسیات میں مشغولیت ہے۔ سعید جدید کی تمنا تھی کہ کاش سعید قدیم سیاست سے کنارہ کش رہتا اور اپنی پوری قوتیں قومی تعمیر اور تعلیم و تربیت میں صرف کرتا۔ سعید جدید کی اس رائے کے صحیح ہونے کی سب سے نمایاں دلیل یہ ہے کہ موصوف کا حکمرانوں اور سیاستدانوں سے کنارہ کش ہو جانا پہلے سے زیادہ ان کی صفوں میں ہلچل ڈال دینے کا موجب ہوا۔ اور آپ کے اس عزم نے ان کے منصوبوں کے جس حد تک تار و پود بکھیرے آپ کی سابق سیاسی مساعی اس حد تک اثر انداز نہ ہو سکی تھیں۔ اس کی تفصیلات ہمیں آئندہ صفحات میں سعید جدید کے حالاتِ زندگی میں معلوم ہوں گی۔

وعظ وارشاد کی ابتداء بدیع الزمان نے اپنی زندگی کے دوسرے باب کا افتتاح اس فقرے سے کیا:
اعوذ باللہ من الشیطان والسیاسۃ (میں شیطان اور سیاست سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں)۔ اس کے بعد اپنی زندگی کے بابِ جدید کے تمام صفحات انہی کلمات پر مبنی دستور کے تحت رقم کیے۔ آپ نے انقرہ کو ترک کر دیا اور بلدۂ وان میں ایک گوشۂ خمول میں جا بیٹھے۔ حکام اور نمائندگانِ اسمبلی سے الگ تھلگ، سیاست اور سیاستدانوں کے تمام مسائل سے دور و بیگانہ۔ وہاں آپ ہدایت و ارشاد کے نغمے نوجوانوں کے اندر بکھیرنے لگ گئے اور پڑھے لکھے افراد خاص طور پر آپ کی توجہات کا مرکز بنے۔ آپ کے یہ نغمے اور وعظ رسائل کی صورت میں پھیلتے تھے جنہیں بعد میں "رسائلِ نور" کہا گیا اور ان رسائل کے پھیلانے والوں اور ماننے والوں کو "جماعتِ نور" کے نام سے یاد کیا گیا۔

قرآن کی تفسیر و تشریح "رسائل نور" ۱۲۵ رسائل پر مشتمل ایک سلسلۂ وعظ و ارشاد ہے۔ ان رسالوں میں ان تمام روحانی، نفسیاتی اور عقلی مسائل و مشکلات کا جواب دیا گیا ہے جو نژادِ حاضر کے ذہنوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان رسالوں کا محور قرآن اور اس کی تفسیر ہے۔ بدیع الزمان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک آیت کی دو تفسیریں بیان کرتے ہیں۔ پہلی تفسیر میں وہ آیت کے ظاہری مفہوم کی توضیح کرتے ہیں اور دوسری تفسیر میں وہ آیت زیرِ بحث کی روشنی میں دلائلِ ایمان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس کے وہ کائناتی اسرار و رموز بے نقاب کرتے ہیں جو عہدِ حاضر اور اس کے تہذیبی رول سے متعلق ہیں۔

رسائلِ نور کی اشاعت کا طریقہ بدیع الزمان یہ رسائل خود شاذ و نادر ہی لکھتے تھے۔ اس لیے کہ موصوف کو لکھنے کی مشق نہیں تھی۔ وہ وجد و تأثر کی حالت میں اپنے خیالات و افکار کو املاء کراتے تھے اور ان کے شاگرد عجلت کے ساتھ انہیں قلمبند کرتے جاتے تھے۔ عوام الناس کے اندر ان رسائل کی اشاعت و توسیع کی جو کیفیت سامنے آتی ہے وہ ایک خارق العادت اعجوبہ ہے اور اس حرارت کی پردہ کشائی کرتا ہے جو دین کا عقیدہ و تصور اپنے ماننے والوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے اور جس کی بدولت کمزوری قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے، بزدلی شجاعت میں بدل جاتی ہے اور کاہلی کے بجائے طبیعت میں جاندار اور سرگرم انقلابی جذبہ ابھر آتا ہے۔

یہ وہ دَور تھا جب کہ اتا ترک کا اصل چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا اور اس نے ہر طرح کی دینی سرگرمیوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا تھا جن میں سرِ فہرست عربی رسم الخط اور عربی زبان کا لٹریچر تھا۔ جماعت نُور نے اپنے استاذ کے رسائل کو پھیلانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس جماعت کا ہر فرد بالالتزام ہر نئے رسالے کے جتنے نسخے تیار کر سکتا تھا کر لیتا اور جب وہ اُسے قارئین کے درمیان تقسیم کر دیتا تو ان میں سے ہر فرد اپنی جگہ پر اس فرض کو سرانجام دیتا اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ رسائل نقل در نقل عام لوگوں کے ہاتھوں تک اس طرح پھیل جاتے جیسے پانی کے ذخیرے میں پتھر پھینک دینے سے سطحِ آب پر باہم پیوستہ و مربوط دائرے پھیل جاتے ہیں۔ اس طرح یہ رسالے حیرت ناک سرعت کے ساتھ مختلف شہروں اور بستیوں میں اور مختلف حلقوں میں آن کی آن میں بکھر جاتے۔ جماعت نور نے تقریباً ۲۰ سال تک اسی اسلوب سے رسائلِ نور کو پھیلایا ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ہاتھوں نے اس کام میں وہ حیرت انگیز قوت دکھائی ہے جس سے طباعت کی مشینیں بھی عاجز ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ کئی کئی نوجوان لڑکیاں جیلوں میں ٹھونسی گئیں اور انہیں سزائیں دی گئیں کیونکہ حکام کو یہ پتہ چل جاتا تھا کہ یہ لڑکیاں راتوں کو دیر تک جاگتی رہتی ہیں اور ان رسالوں کو نقل کرتی ہیں اور پھر انہیں لیٹر بکسوں میں ڈال دیتی ہیں یا اسکولوں کی کلاسوں میں بکھیر آتی ہیں۔

اسپارٹا میں جلاوطنی | بدیع الزمان کے رسائل اور ان کی جماعت جو آن کی آن میں قوت پکڑ گئی اور مختلف علاقوں میں پھیل گئی مصطفیٰ کمال کے لیے ایک لادینی معاشرہ وجود میں لانے کے راستے میں پہلا روڑا ثابت ہوئی۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال نے بدیع الزمان کو اسپارٹا کے ایک دُور افتادہ علاقہ "بارلا" میں جلاوطن کر دینے کے احکام صادر کر دیے۔ وہاں موصوف کو شدید پہروں کے ساتھ یکہ و تنہا رکھا گیا۔ مگر بدیع الزمان کی پُرکشش شخصیت نے خود پہرہ داروں کے دلوں میں اُترنا شروع کر دیا اور تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ پہرہ داروں کا ایک گروہ آپ کی دعوت کا حامی اور آپ کے اسلامی نظریات کا علمبردار ہو گیا۔ اس موقع سے موصوف نے فائدہ اٹھایا اور اپنے اُن رسائل کی تصحیح میں وقت گزارنے لگے جو تلامذہ کی طرف سے اُن کے پاس پہنچتے رہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے الحاد و لادینیت کے خلاف بھی بھرپور تنقیدیں تیار کیں۔

بدیع الزمان پر دوسرا مقدمہ بدیع الزمان نے "بارلا" کے قید خانے میں آٹھ سال گذارے جیل میں موصوف اپنا کھانا خود ہی تیار کرتے تھے۔ خود ہی اپنے کپڑے دھوتے تھے اور دوسرے تمام امور خود ہی سرانجام دیتے رہے مصطفیٰ کمال نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا۔ چونکہ بدیع الزمان کے قلب حق پرست سے اٹھنے والی دینی شعاعیں برابر لوگوں کے اندر بکھر رہی تھیں اور ان کے رسائل کی اشاعت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے مصطفیٰ کمال نے بذریعہ حکم بدیع الزمان کو اور ان کے ۱۲۰ طلبہ کو سخت پہروں کے ساتھ "اسکی شہر" کی جیل میں منتقل کروا دیا۔ اور وہاں ان پر ایک خفیہ تنظیم کے قیام اور حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا طویل تحقیقات کے بعد حکومت کو کوئی ایسا ثبوت نہ ملا جو موصوف پر عائد شدہ الزامات کو درست قرار دے سکے۔ اس کے باوجود عدالت نے موصوف کو ۱۱ ماہ قید کی سزا دی۔

اس مقدمے میں بدیع الزمان نے عدالت کے سامنے جو حیرت انگیز بیانات دیئے ہیں اگر رسالہ کے صفحات اجازت دیتے تو انہیں کامل طور پر نقل کر دیا جاتا۔ لیکن تنگیٔ مقام کی وجہ سے ذیل کے چند فقرات پر اکتفا کیا جاتا ہے:

"حاکمانِ محترم! مجھے یہاں اس الزام میں لایا گیا ہے کہ میں قدامت پرست ہوں، دین کے پردے میں امن عامہ میں خلل ڈالتا ہوں۔ میری عرض ہے کہ کیا کسی فعل کے ممکن الوقوع ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ وہ ضرور وقوع پذیر بھی ہوگا لہٰذا اس پر سزا کا فیصلہ کر ڈالا جائے۔ مثلاً دیا سلائی کے اندر ایک گھر کو جلا دینے کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن اس امکان محض سے کسی جرم کے ارتکاب کا فیصلہ نہیں دیا جا سکتا اسی طرح تعلیمات چاہے جو اثر بھی رکھتی ہوں لیکن ان میں میرا انہماک صرف رضائے الٰہی کیلئے ہے۔ اس کے ماسوا اور کوئی غرض پیش نظر نہیں ہے۔"

"آپ پوچھتے ہیں کہ کیا میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تصوف کے سلسلوں کا شغل رکھتے ہیں؟ میری عرض یہ ہے کہ ہمارا یہ زمانہ ایمان کی حفاظت کا زمانہ ہے۔ تصوف کے کسی سلسلے کی حفاظت کا زمانہ نہیں ہے۔ ایسے لوگ تو بہت ہیں جو جنت میں کسی سلسلے کے ساتھ وابستگی رکھے بغیر داخل ہو جائیں گے لیکن کوئی شخص ایمان کے بغیر جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

"آپ پوچھتے ہیں: اپنے اردگرد جو جماعت تم نے جمع کر رکھی ہے اس کو جمع کرنے کے لیے تمہارے پاس روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ لیکن میں یہ سوال کرنے والوں سے پوچھتا ہوں ان کو ایسی دستاویزات کہاں سے مل گئی ہیں جن سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ میں نے کوئی تنظیم قائم کر رکھی ہے اور میں ایسی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے ہوں جن کے لیے روپے کی حاجت لاحق ہوتی ہے؟

"آپ حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ میں جو کچھ کام کر رہا ہوں یہ سرکاری حیثیت سے نہیں ہے۔ اور درس و تدریس کے کام کے لیے حکومت کا ایک خاص محکمہ مقرر ہے لہٰذا پہلے مجھے اس سے لائسنس حاصل کرنا ہے۔ لیکن میں گزارش کروں گا: اگر تمام قبروں کے دروازے مقفل کر دیے گئے ہوتے، اور موت کا وجود دنیا سے معدوم کر دیا گیا ہوتا تب درس و تدریس کی اجازت کا انحصار صرف تمہارے محکمہ پر درست ہوتا۔ مگر یہ ۳۰ ہزار جنازے (اپنے فداکار ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہر روز موت کے دروازہ پر دستک دے رہے ہیں اور موت کے فیصلے کے منتظر ہیں .... یہاں دوسرے بہت سے فرائض و واجبات ادا کرنے باقی ہیں جو ان کاموں سے زیادہ اہم ہیں جو تمہارے محکمے کے پیش نظر ہیں"۔

کاستامونی میں نظر بندی | بدیع الزماں کی مدتِ قید ختم ہی ہوئی تھی کہ آپ کو "کاستامونی" کے مقام میں نظر بند کر دیا گیا۔ کاستامونی دور افتادہ شہر ہے اور بحر اسود کے ساحل پر واقع ہے۔ کاستامونی میں آپ کو پولیس اسٹیشن کے بالمقابل ایک مقام میں رکھا گیا۔ آپ اس حالت میں بھی برابر مختلف اسلامی موضوعات پر اپنے خیالات کو پیش کرتے رہے۔ اور ملتِ اسلامیہ کو اکساتے رہے کہ اس الحاد و بے دینی کے سیلاب کے مقابلے میں مسلمان اپنے دین کو ہرگز ترک نہ کریں۔ نوجوان طبقے سے اپیل کرتے رہے کہ اُسے اسلام اور قرآن سے ناواقفیت کی بنا پر اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہیں باندھنی چاہیے۔ آپ کے رسالے اور پمفلٹ بلاناغہ خفیہ طور پر آپ کے شاگردوں کے ہاتھوں تک پہنچتے رہے اور

وہ انہیں کثیر تعداد میں نقل کر کے دوسروں تک ڈاک کے ایسے نظام کے تحت پہنچاتے رہے جو خود اُن کا اپنا قائم کیا ہُوا تھا۔ ان رسائل کی جلوہ افروزیاں یونیورسٹیوں سے لے کر فوج کے کیمپوں اور سرکاری محکموں تک ممتد تھیں۔ ان تمام حلقوں میں رسائلِ نور مختلف ذرائع و وسائل سے غیر محسوس طور پر بکھر جاتے تھے۔

مصطفیٰ کمال کی بدحواسی آخرکار مصطفیٰ کمال نے ایوانِ حکومت میں ایک زلزلہ محسوس کیا۔ اور رسائلِ نور کے اثرات کو دیکھ کر مخبوط الحواس ہو گیا، حالانکہ یہ رسائل سیاسیات سے قطعاً کوئی تعرض نہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ اُسے اپنی حکومت کو شدید خطرہ اور اپنے اقتدار کو نمایاں دھچکا محسوس ہونے لگا۔ اور اُسے پُورا اندازہ ہو گیا کہ دلوں کے اندر قرآن کے نور اور اسلام کے حقائق کا جڑ پکڑ لینا ہی اس غرض کے لیے کافی ہے کہ اسلام کے خلاف جو سیاسی منصوبہ بنایا جائے، جو سازش تیار کی جائے اور جو تدبیر سوچی جائے وہ درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال نے ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا اور اُس میں فری میسن کے ان نامور لیڈروں کو مدعو کیا جنہوں نے خلافتِ اسلامی کا قصر مسمار کرنے اور اُس کے کھنڈروں پر سیکولر حکومت قائم کرنے کے لیے غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔ اس اجلاس میں غور و خوض کے بعد بالاتفاق یہ طے پایا کہ بدیع الزمان پر دوبارہ خفیہ تنظیم قائم کرنے اور انقلابی حکومت کو نقصان پہنچانے اور مصطفیٰ کمال کو دجّال کہنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔

بدیع الزمان کے رسائل کی جانچ پڑتال اس فیصلہ کے فوراً بعد فری میسن لیڈروں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا اور اس کے سپرد بدیع الزماں کے رسائل کی جانچ پڑتال کا کام کیا گیا۔ لیکن بدیع الزمان نے اس بورڈ سے مقاطعہ کا اعلان کیا اور کہا جو شخص کسی نظریہ کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو وہ اس کے بارے میں کسی قسم کی تحقیقات کا اہل نہیں ہے۔ ان کے بجائے موصوف نے تحقیقات کے لیے یورپ کے غیر جانبدار فلاسفر و مفکرین کو بلانے کا مطالبہ کیا۔ اور بالآخر موصوف کا یہ مطالبہ حکومت کو تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ غیر جانبدار افراد پر مشتمل ایک اور کمیٹی بنائی گئی جس نے موصوف کے رسائل کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ یہ رسائل خالص مذہبی مضامین پر مشتمل ہیں۔

اور کسی قسم کی حزبیت اور سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھیوں نے مزید الزام یہ تراشا کہ بدیع الزماں اپنی مخصوص سیاسی اغراض کو پورا کرنے کے لیے مذہبی لیڈرشپ کا سہارا لے رہا ہے۔ لیکن وہ اس الزام کو ثابت کرنے میں بھی خائب و خاسر رہے کیونکہ اس انسان کی زندگی ہر قسم کے عیش و تنعم کے مظاہر اور قیادت و ترفع کی حرص سے کوسوں دور تھی۔ عدالت نے اس مرتبہ بھی طویل مقدمہ بازی اور بسیار لیت و لعل کے بعد تمام الزامات سے بری قرار دے دیا۔ براءت کا اعلان ۱۶ رجون ۱۹۴۴ء کو ہوا۔

انکوائری بورڈ کے سامنے موصوف کے پُراثر بیانات اس تمام مقدمہ بازی میں حکومت کو اُلٹا نقصان پہنچا۔ موصوف نے انکوائری بورڈ کے سامنے جو بیانات دیئے تھے انہوں نے ملک کے اندر غیر معمولی اثرات ڈالے۔ ان بیانات سے مسلمان عوام کے دلوں میں ایک ایسی برقی رو دوڑ گئی جس نے دلوں کے اندر ایمان و جہاد کے شعلے فروزاں کر دیئے اور انہیں اسلام اور دعوتِ حق کی راہ میں ہر تکلیف و اذیت ہیچ نظر آنے لگی۔ اور جیل اپنی فتنہ سامانیوں کے باوجود جماعتِ نُور کی نگاہ میں ـــ جس کی تعداد ان ایام میں دس لاکھ مرد و عورت سے بڑھ گئی تھی ـــ تکلیف و عذاب اور رنج و محن کا گھر نہیں بلکہ ان کی اصطلاح میں "یوسفی تربیت گاہ" قرار پا گئی اور وہاں ہر شخص داخل ہونے اور سندِ فراغت حاصل کرنے کو باعث سعادت سمجھنے لگا۔

ذیل میں موصوف کے ان اہم بیانات کے چند فقرے نذرِ قارئین ہیں:

"جی ہاں، ہم ایک جمعیت ہیں، یہ وہ جمعیت ہے جو ہر دور میں ۳۰ کروڑ افراد پر مشتمل رہی ہے، یہ ۳۰ کروڑ ارکان ہر روز ۵ مرتبہ اپنی جمعیت کے مقدس دستور سے کامل وابستگی و وفاداری کا اعلان کرتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ اس جمعیت کے سب سے اہم شعار کو قائم کرنے کے لیے مسابقت کرتے رہتے ہیں۔ وہ شعار ہے: انما المومنون اخوة۔ پس ہم اس عظیم و مقدس جمعیت کے ارکان ہیں۔ ہمارا کام مومن بھائیوں کو قرآن کے حقائق و احکام سے پختہ طور پر متعارف کرانا ہے۔ اور ہماری یہ خدمت اس بنا پر ہے

کہ یہ ہمیں آخرت کی ابدی جیل سے نجات دلائے گی۔"

"تم لوگ رسائلِ نور کی تحریک کس بنیاد پر روک سکتے ہو، حالانکہ یہ تحریک سراسر قرآن کے حقائق و احکام کی خدمت ہے۔ اور قرآن ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو خدائے برتر کے عرشِ عظیم سے مربوط ہے۔ اور وہ کون احمق ہے جو ایک ایسی حقیقت سے ٹکرانا چاہتا ہے جو عرشِ عظیم سے مربوط ہو۔"

"میرے اس بیان کے مخاطب صرف عدالت کے ارکان ہی نہیں بلکہ میرا روئے سخن اسپارٹا کے سازشی گروہ کی طرف بھی ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں پر تو سیاسی مکر و فریب اور خفیہ تنظیمیں چلانے کا الزام دھرا جاتا ہے جو آپس میں قرآن کے تحیّہ کو رواج دیتے ہیں، قرآن کے بیانات و معجزات کو پھیلاتے ہیں مگر ڈاکٹر دوزسے جیسے ملحد کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ پوری بے حیائی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ قرآن اور اس کے حقائق پر افترا پردازی کرتا رہے بلکہ اُس کی افترا پردازیوں کو ایک مقدس کام سمجھا جاتا ہے اور اسے فکر و رائے کی آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے فکر و رائے کی آزادی مگر قرآنی انوار کو ۔ ۔ جو اُن کروڑوں مسلمانوں کے دلوں تک پہنچ کر رہیں گے جو قرآن کے دستور سے وابستہ ہو چکے ہیں ـــــ خطرے کی گھنٹی کہا جاتا ہے۔ اور اُن پر شر، خیانت اور سیاست اور اس طرح کی تمام گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔"

"تم مجھے جمہوریہ ترکیہ سے بغاوت کا الزام دیتے ہو۔ لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ طالب علمی کے زمانے سے میرا یہ معمول ہے کہ جب میرے سامنے روٹی اور سالن آتا ہے تو اس میں سے میں جب اپنا حصّہ کھا لیتا ہوں تو بقیہ چیونٹیوں کی ٹولیوں کو ان کی اجتماعیت پسندی کی قدر دانی اور اُن کی اخوت و تنظیم کے احترام میں پیش کر دیتا ہوں۔ اس عادت سے آپ ایک صالح جمہوری نظام سے میری محبت و گرویدگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں بلکہ صحیح جمہوری نظام کو میں جس حد تک مقدس و پاکیزہ گردانتا ہوں اُس کی سب سے بڑی

دلیل یہ ہے کہ مجھے خلفائے اسلام سے بے پناہ عقیدت ہے۔ یہ بزرگ لوگ خلفاء ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جمہوری ریاست کے صدر بھی ہوتے تھے۔ اور ان کی زندگیاں محض زبانی جمع خرچ کی حد تک نہیں بلکہ حقیقت وواقعہ میں صحیح جمہوریت کا نمونہ ہوتی تھیں۔"

"رہا سیکولر جمہوریت کا معاملہ، تو ہمیں بتایا گیا ہے کہ سیکولر جمہوریت وہ ہوتی ہے جو دین سے کسی نوعیت کا بُرا یا بھلا تعرّض نہ کرے۔ لیکن تم لوگوں نے ___ جو سیکولر جمہوریت کے علمبردار ہو ___ ہر قسم کی غنڈہ گردی، اخلاقی بدکاری، اور وجدان وفکر کی آزادی کی آڑ میں خدا اور کائنات پر طرح طرح کی افتراپردازی کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اور جب کبھی قرآن کی کسی آیت کی تفسیر بیان کی جاتی ہے اور اس کے حقائق ورموز بیان کیے جاتے ہیں تو تم جو واویلا مچانے لگتے ہو کہ "یہ خفیہ تنظیم ہے، یہ سیاسی شغل ہے، یہ ملک وملت کے لیے خطرہ ہے"۔ تمہارے نزدیک یہ کام "تنا "خطرناک" اور "مجرمانہ" ہے کہ تم لوگ اسے سیکولرازم کی آڑ میں دبانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر یہی بات ہے نوجوان لو کہ اگر میرے پاس ہزار جانیں بھی ہوں تو میں ان ہزار جانوں کو بھی کائنات کی اہم ترین حقیقت یعنی دین حق کی راہ میں نچھاور کرنے میں دریغ نہ کروں گا۔ اور تمہاری ستم رانیوں کے مقابلے میں میرے لیے ایک ہی محفوظ پناہ گاہ ہے اور وہ ہے "حسبنا اللہ ونعم الوکیل"۔"

"تم سر مٹکا مٹکا کر کہتے ہو: میری مذہبی سرگرمیاں موقع پرستی پر مبنی ہیں اور امن عامہ میں خلل ڈالنے کے لیے ہیں۔ لیکن میں جواب میں کہوں گا: تمہارا یہ دعویٰ خود موقع پرستی پر مبنی ہے اور امن عامہ کے تحفظ کی آڑ میں دین کو ملیامیٹ کرنے کے لیے ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ رسائل نور ۲۰ سال سے ضوفشانی کر رہے ہیں لیکن کیا ان ۲۰ سالوں کے اندر تم کوئی ایک واقعہ بھی پیش کر سکتے ہو جس سے امن عامہ کو نقصان پہنچا ہو۔ معلوم ہوا کہ دستور کی تحفظ امن عامہ سے متعلق دفعہ نمبر ۱۶۳ ایک ایسے گیند سے عبارت ہے جسے جدھر چاہو تم پھینک سکتے ہو۔ اور تمہاری چاہت بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے یہاں سے

دینِ حق کو کسی نہ کسی طرح سے ختم کرنا۔ اسے دین کو دنیا کے عوض بیچنے والو! اور اسے کفر صریح میں غرق ہو جانے والو، اللہ نے مجھے جتنی کچھ قوت عطا کی ہے مَیں اُس کے بل پر تم سے صاف کہتا ہوں: تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو، ہماری آخری آرزو یہ ہے کہ ہم اسلام کے حقائق میں سے ایک معمولی حقیقت کی خاطر بھی اپنے سر کٹوا دیں۔"

"ہم ہر لحظہ سزائے موت کے احکام کے منتظر ہیں۔ موجودہ صورت حال میں خارجی جیل ہمارے لیے اندرونی جیل سے سو گنا زیادہ تکلیف دہ ہے۔"

"تم الزام دیتے ہو: تو نے بیس سالوں میں ایک مرتبہ بھی ہمارا ہیٹ نہیں پہنا . . . اور تو نے ایک مرتبہ بھی ہماری عدالت کے احترام میں اپنے سر کو ننگا نہیں کیا حالانکہ ملین افراد اس لباس کو اختیار کر چکے ہیں لیکن میں کہوں گا: یہ ملین افراد نہیں ہیں نہ ملین میں بلکہ ایک قلیل تعداد بھی ایسے لوگوں کی نہیں ہے جنہوں نے محض اپنی مرضی سے اسے پہن ہو۔ چند مٹھی بھر احمق ہیں جنہوں نے اسے دل سے قبول کیا ہے۔ یہ لوگ یورپ کی ہر رذالت اور گراوٹ پر رال ٹپکانے والے ہیں۔"

"میرے جیسا آدمی، جو بیس سال سے اجتماعی زندگی سے کنارہ کش ہے۔ اس پر اس طرح کے عناد کا الزام نہیں دھرا جا سکتا۔ اور اگر فرض کرو یہ روش مبنی بر عناد بھی ہے تو جب خود مصطفیٰ کمال میرے عناد کا زور نہیں توڑ سکا اور وہ عدالتیں، اور تین صوبوں کی حکومتیں مجھ پر اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں تو تم کون ہو جو یہاں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

تحقیقاتی عدالت نے بدیع الزماں کو بے گناہ ثابت کر دیا۔ لیکن بایں ہمہ موصوف جیل میں پڑے رہے اور کچھ عرصہ کے بعد صوبہ "آفیون" کے تعلقہ "امیر ضارغ" میں ان کو جلا وطن کر دینے کے احکام صادر ہوئے۔ اور وہاں ان پر کڑی نگرانی اور سخت پہروں کے انتظامات کیے گئے۔ لیکن تقدیرِ الٰہی کی کرشمہ سازیاں انسانی استبداد کی تدبیروں پر خندہ زن ہو رہی تھیں۔ تمام پہروں کے باوجود موصوف

کے شاگردوں کا آپ کے ساتھ برابر رابطہ قائم رہا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان شاگردوں کے پہلے گروہ میں ان لوگوں کی ایک تعداد بھی تھی جو مذکورہ بالا عدالتوں کے جج تھے۔ اور دوران مقدمہ موصوف سے متاثر ہوئے تھے۔ موصوف کے عدالتی بیانات اور زیر تحقیقات رسائل نے خود عدلیہ کے ارکان پر اس قدر اثر ڈالا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ موصوف کے ارشد تلامذہ کی صف میں شامل ہو گئے اور دعوتِ اسلامی کے سب سے سرگرم پرچارک بن گئے۔

تحریکِ نور کا شدید دباؤ اور رسائل نور پر پابندیوں کا خاتمہ | بدیع الزماں ۱۹۴۷ء تک امیر صاغ میں جلاوطنی کے ایام گذارتے رہے جہاں فوج کا سخت پہرہ ہوتا تھا اور چوری چھپے ہی ان سے کوئی شخص مل سکتا تھا لیکن بعد میں ترکی حکومت نے شاگردوں کو آپ سے ملنے جلنے کی عام اجازت دے دی۔ اور آپ کے رسائل کی طباعت و اشاعت پر سے بھی پابندیاں اٹھا لیں۔ حکومت کے موقف میں اس اہم تبدیلی کی وجہ یہ ہوئی کہ جماعتِ نور ملک کے اندر غیر معمولی فروغ ہو گیا۔ اور اس کے متوسلین سرکاری محکموں اور دفاتر تک میں کثیر تعداد میں پیدا ہو گئے۔ چنانچہ تحریک کے دباؤ کے تحت حکومت کو "قانون اتاترک" کے اندر تعلیم اور مذہبی سرگرمیوں سے متعلق قوانین میں ترمیمات کرنی پڑیں اور اس تشدد و تعصب کو کم کرنا پڑا جو "قانونِ اتاترک" میں تھا۔

بدیع الزمان کا ایک انقلاب انگیز خط | مذہبی تعلیم اور مذہبی آزادی کے لیے حکومت پر جماعتِ نور کی طرف سے یکایک دباؤ ڈالا گیا اور یہ دباؤ ایک تند و تیز تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کا محرک دراصل بدیع الزمان کا ایک خط تھا جسے موصوف نے جیل سے اپنی جماعت کی وساطت سے حکومت کے نام بھیجا تھا۔ اور اس میں تین عدالتوں کی طرف سے بری ٹھہرائے جانے کے باوجود اپنی شہری آزادیوں کے بلا وجہ سلب کیے جانے پر شدید احتجاج کیا تھا۔ اس رسالہ میں موصوف نے ایک مقام پر لکھا تھا:

> "یہ چند گذارشات میں حکومت کی وساطت سے انقرہ اور انقرہ والوں کے کانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جب مدعی ہی منصف ہو تو پھر اپیل و دلیل کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ میں اس دھاندلی پر مدت سے انگشت بدنداں ہوں۔ . . آج میں ـــ جبکہ

میں آزاد بھی ہوں اور پابند بھی۔ ان ایام کی نسبت بہت زیادہ قلق و اضطراب میں ہوں جب میں کلیتہً نذرِ زنداں تھا۔ آج کا ایک دن میری سابقہ قیدِ تنہائی کے ایک سال سے بھی زیادہ مجھ پر سخت گزر رہا ہے۔ شدید سردی کے ہجوم میں اس ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود مجھے ہر چیز سے محروم رکھا جاتا ہے۔ میں پورے بیس سال سے جیل و جلاوطنی کے المیہ سے دوچار ہوں۔ اب مزید ایسے عذاب و تشدد کا دوام اللہ تعالیٰ کے عذابِ عام کو دعوت دے کر ہی رہے گا۔"

"موجودہ حکومت کا سب سے اہم انسانی فرض یہ ہے کہ وہ میرے انسانی حقوق کا جن سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا، تحفظ کرے۔ کیونکہ حکومت میری بیس سالہ تصنیفات کی پورے ۹ ماہ تک جانچ پڑتال کرانے کے بعد میری برادت کو ماننے پر مجبور ہوئی ہے۔ لیکن یہاں کچھ ایسے خفیہ ہاتھ کام کر رہے ہیں جن کے پیشِ نظر اجنبی نفوذ کی خدمت اور دین و وطن کی بنیادوں کا انہدام ہے۔ یہ ہاتھ مجھے مجرم ٹھیرانے کے لیے اور میری زبان کاٹنے کے لیے رائی کا پہاڑ بنانے سے بھی نہیں گریز کرتے۔ ان کی ایک ہی خواہش ہے، وہ یہ ہے کہ میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں: "بس اتنی سزا میرے لیے کافی ہے۔"

"آج مجھے — میری بیس سالہ محبوسیت کے باوجود — تمام انسانی حقوق سے محروم کر دینا اس دور کا سب سے بڑا گناہ ہے اور ظلم و ستم کی سب سے سخت قسم ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ کچھ ذمہ دار افراد نے حکومت کو مجبور کیا ہے کہ وہ میرے لیے مذہبی الاؤنس مقرر کر دے۔ ان حضرات کا شکریہ! لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے لیے ہر چیز سے زیادہ عزیز و اہم ادائے فرض کی آزادی ہے۔ یہی میرے دستورِ زندگی کی سب سے پہلی دفعہ ہے۔"

من گھڑت الزامات اور جھوٹے پروپیگنڈے کی بنا پر میری آزادی کا سلب کر لیا جانا میری

(باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

رسائل و مسائل

انعامی بانڈس

سوال - آج کل حکومت کی طرف سے امدادی قرضوں کے تمسکات جو انعامی بانڈس کی شکل میں جاری کیے گئے ہیں، ان میں شرکت کرنا اور ان پر متوقع انعام کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ قمار نہیں کیوں کہ ہر شخص کی قرض کی اصل رقم بہرحال محفوظ ہے جو بعد میں ملے گی۔ اس پر کوئی متعین شرح سے اضافہ بھی بانڈ ہولڈر کو نہیں ملتا جسے سُود قرار دیا جائے۔ براہِ کرم اس کاروبار کی شرعی حیثیت کو واضح کیا جائے کیونکہ بہت سے لوگ اس معاملے میں خلجان کا شکار ہیں۔

جواب - انعامی بانڈس کے معاملہ میں صحیح صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بانڈس بھی اسی نوعیت کے قرضے ہیں جو حکومت اپنے مختلف کاموں میں لگانے کے لیے لوگوں سے لیتی ہے اور ان پر سود ادا کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ہر وثیقہ دار کو اس کی دی ہوئی رقم پر فرداً فرداً سود دیا جاتا تھا، مگر اب جملہ رقم کا سُود جمع کر کے اسے چند وثیقہ داروں کو بڑے بڑے "انعامات" کی شکل میں دیا جاتا ہے، اور اس امر کا فیصلہ کہ یہ "انعامات" کن کو دیئے جائیں؛ قرعہ اندازی کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ پہلے ہر وثیقہ دار کو سُود کا لالچ دے کر اس سے قرض لیا جاتا تھا۔ اب اس کے بجائے ہر ایک کو یہ لالچ دیا جاتا ہے کہ شاید ہزاروں روپے کا "انعام" تیرے ہی نام نکل آئے، اس لیے قسمت آزمائی کرے۔

یہ صورتِ واقعہ صاف بتاتی ہے کہ اس میں سود بھی ہے، اور بدرجۂ قمار بھی۔ جو شخص یہ وثائق

خریدتا ہے وہ اوّلاً اپنا روپیہ جان بوجھ کر ایسے کام میں قرضے کے طور پر دیتا ہے جس میں سُود لگایا جاتا ہے۔ ثانیاً جس کے نام پر "انعام" نکلتا ہے اسے دراصل وہ سود اکٹھا ہو کر ملتا ہے جو عام سودی معاملات میں فرداً فرداً ایک ایک وثیقہ دار کو دیا جاتا تھا۔ ثالثاً جو شخص بھی یہ وثیقے خریدتا ہے وہ مجرد قرض نہیں دیتا بلکہ اس لالچ میں قرض دیتا ہے کہ اسے اصل سے زائد "انعام" ملے گا اور یہی لالچ دے کر قرض لینے والا اس کو قرض دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لیے اس میں نیت سُودی لین دین ہی کی ہوتی ہے۔ رابعاً جمع شدہ سُود کی وہ رقم جو بصورت "انعام" دی جاتی ہے اس کا کسی وثیقہ دار کو ملنا اسی طریقے پر ہوتا ہے جس پر لاٹری میں لوگوں کے نام "انعامات" نکلا کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ لاٹری میں انعام پانے والے کے سوا تمام باقی لوگوں کے ٹکٹوں کی رقم ماری جاتی ہے اور سب کے ٹکٹوں کا روپیہ ایک انعام دار کو مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں انعام پانے والوں کے سوا باقی سب وثیقہ داروں کی اصل رقمِ قرض نہیں ماری جاتی بلکہ صرف وہ سُود، جو سُودی کاروبار کے عام قاعدے کے مطابق ہر داشن کو اس کی دی ہوئی رقم قرض پر ملا کرتا ہے، انہیں نہیں ملتا، بلکہ قرض کے ذریعہ سے نام نکل آنے کا اتفاقی حادثہ ان سب کے حصوں کا سود ایک یا چند آدمیوں تک اس کے پہنچنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ بعینہٖ قمار تو نہیں ہے مگر اس میں روحِ قمار ضرور موجود ہے۔ (ا-م)

مسئلۂ دجّال

سوال۔ مولانا مودودی کے خلاف جو الزامات وقتاً فوقتاً لگائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک الزام یہ ہے کہ انہوں نے دجّال کی آمد کا انکار کیا ہے اور جن احادیث میں دجّال کا ذکر ہے انہیں افسانہ قرار دیا ہے، نیز یہ کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ اس بارے میں شک میں مبتلا تھے اور جو باتیں آپ نے دجّال کے متعلق فرمائی تھیں وہ غلط ثابت

ہوئی ہیں۔ ایک عام مسلمان کے سامنے جب ایسی چیزیں مولانا مودودی کی جانب منسوب کی جاتی ہیں تو اس کی رائے مولانا کے خلاف بہت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اصل پوزیشن کو صاف اور واضح کیا جائے اور کوئی غلط بات اگر مولانا کے قلم سے نکلی ہے تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔

جواب۔ جس الزام کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے وہ اپنے پورے اجزاء اور تفصیلات سمیت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مولانا مودودی نے ایک مستفسر کے جواب میں اس مسئلے پر جو کچھ تحریر کیا تھا وہ "رسائل و مسائل" حصہ اول میں چھپ چکا ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کا مفہوم اخذ کرنے اور جسے صحیح جہت پر محمول کرنے میں کوئی وقت پیش آتی۔ اس کے باوجود بعض حضرات نے اس تحریر پر اس انداز سے حاشیہ آرائی کرنی شروع کر دی جس سے سخت غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں جب مولانا مودودی جیل میں تھے، انہیں اس صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ اس پر انہوں نے اپنی سابق تحریر کے متعلق ایک استدراک لکھ کر بھیجا تاکہ اسے "ترجمان القرآن" میں شائع کر دیا جائے۔ اس کا یہاں نقل کر دینا مناسب ہوگا:

"ایک دوست نے مجھے رسائل و مسائل حصہ اول کے مضمون "تحقیق حدیث دجال" کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کے بعض الفاظ اور فقروں سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے۔

معاذ اللہ کیا کوئی مسلمان اس بارگاہ میں گستاخی کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے اور اگر کرے تو ایک لمحہ کے لیے بھی دائرہ ایمان میں رہ سکتا ہے؟ میرے کسی دینی بھائی کو یہ سوئے ظن تو مجھ سے نہ کرنا چاہیے کہ میں کبھی اس کفر سے بھی ملوث ہو سکتا ہوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلے کے بیان میں ایک طرز تعبیر میرے نزدیک حدود شرع و ادب کے اندر ہو، اور دوسرا اس میں کوئی تجاوز محسوس کرے۔ میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا، پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ یہی سمجھتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ حد شرع و ادب کے اندر ہے اور

اب بھی اپنے دوست کے توجہ دلانے کے بعد کافی غور کرنے پر بھی اس میں کوئی تجاوز محسوس نہیں کر سکا ہوں۔ تاہم یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ کوئی شخص اس میں تجاوز محسوس کر سکتا ہے، میں ان عبارتوں کو بدل دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں، تاکہ کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہے۔"

چنانچہ اس کے بعد مولانا نے اپنے سابق جواب کے بعض حصوں کو بدل دیا۔ یہ پورا استدراک فروری ۵۶ء کے ترجمان میں شائع ہو چکا ہے۔ جیل سے باہر آنے کے بعد جب مولانا نے رسائل و مسائل حصہ اوّل کی طبع جدید کے لیے اس کتاب پر نظر ثانی کی ہے، تو انہوں نے اپنی اس تحریر میں ایک آدھ مقام پر عبارت میں مزید تبدیلی کر دی ہے۔ جدید ایڈیشن میں یہ پورا جواب جس طرح شائع ہو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اُسے یہاں بھی نقل کر دیا جائے تاکہ وہ بیک وقت قارئین کے سامنے رہے۔ وہ جواب درج ذیل ہے:

"میں نے جس چیز کو افسانہ قرار دیا ہے وہ یہ خیال ہے کہ دجال کہیں مقید ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ ایک بڑا فتنہ پرداز (الدجال) ظاہر ہونے والا ہے تو اس کے متعلق احادیث میں جو خبر دی گئی ہے میں اس کا قائل ہوں اور ہمیشہ اپنی نماز میں وہ دعائے ماثورہ پڑھا کرتا ہوں جس میں منجملہ دوسرے تعوذات کے ایک یہ بھی ہے کہ " اعوذ بك من فتنة المسيح الدجال"

دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے، اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی، اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔

ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں ان کا اختلاف مضمون خود بھی یہ ظاہر کرتا ہے اور حضورؐ کے طرزِ کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپ نے بربنائے وحی نہیں بلکہ بربنائے ظن و قیاس ارشاد فرمائی ہیں کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ

دجال خراسان سے اٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپ نے ابن صیاد نامی اُس یہودی بچے پر جو مدینہ میں (غالباً ۲ یا ۳ھ میں) پیدا ہوا تھا یہ شبہ کیا کہ شاید یہی دجال ہو۔ اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپ کو یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحر روم یا بحر عرب میں) سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور وہاں ان کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انہیں بتایا کہ وہ خود ہی دجال ہے، تو آپ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی، البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمایا کہ اس بیان کی رُو سے دجال بحر روم یا بحر عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

ان مختلف روایات پر جو شخص بھی مجموعی نظر ڈالے گا وہ اگر علم حدیث اور اصول دین سے کچھ بھی واقف ہو تو اسے یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اس معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات دو اجزاء پر مشتمل ہیں:

جزو اوّل یہ کہ دجال آئے گا، اِن صفات کا حامل ہوگا اور یہ اور یہ فتنے برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپ نے اللہ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔

جزو دوم یہ کہ دجال کب اور کہاں ظاہر ہوگا اور وہ کون شخص ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ روایات مختلف ہیں بلکہ اکثر روایات میں شک اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابن صیاد کے متعلق آپ کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا کہ "اگر دجال یہی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک معاہد کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ یا مثلاً ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد کہ "اگر وہ میری زندگی میں آگیا تو میں حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و

ناسر ہے ہی"۔

اس دوسرے جز کی دینی اور اصولی حیثیت ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جز کی ہے۔ جو شخص اس کی بھی تمام تفصیلات کو اسلامی عقائد میں شمار کرتا ہے وہ غلطی کرتا ہے بلکہ اس کے ہر حصے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ابن صیاد پر آپ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجال ہو، اور حضرت عمرؓ نے تو قسم بھی کھالی تھی کہ یہی دجال ہے مگر بعد میں وہ مسلمان ہوا، حرمین میں رہا، حالتِ اسلام میں مرا اور اس کی نماز جنازہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجائش باقی رہ گئی کہ آج تک ابن صیاد پر دجال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے؟ تمیم داری کے بیان کو حضورؐ نے اُس وقت تقریباً صحیح سمجھا تھا، مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیم نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجال ہونے کی جو خبر حضرت تمیم کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی؟ حضورؐ کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجال نہیں آیا ہے؟ اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق ظاہر نہ ہو تو یہ اس کے منصبِ نبوت میں ہرگز قادح نہیں ہے۔ نہ اس سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مکلف کیا ہے۔ اس اصولی حقیقت کو تابیر نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود واضح فرما چکے ہیں"۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قارئین کے پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ مولانا مودودی نے اپنے رسالہ ختم نبوت میں اور قادیانیوں کے متعلق تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنے تیسرے بیان میں ان تمام احادیث کو جمع

کر دیا ہے جو نزول مسیح، ظہور مہدی اور خروج دجال سے متعلق ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آخر زمانے میں ایک الدجال اپنے آپ کو مسیح کی حیثیت سے پیش کرے گا اور اس کا فتنہ دنیا میں بڑی گمراہی اور ظلم و ستم کا موجب بن جائے گا۔ پھر اللہ اصل مسیح کو واپس بھیجے گا تاکہ وہ اس فتنے کا قلع قمع کریں۔ مولانا کی ان تحریروں سے یہ حقیقت کھل کر بالکل سامنے آجاتی ہے کہ ان کے خلاف انکارِ دجّال کا الزام اپنے اندر صداقت کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں رکھتا۔

مولانا مودودی کے خلاف ایک اعتراض اس پہلو سے بھی کیا جاتا ہے کہ اگر وہ آمد دجّال کے منکر نہیں ہیں تو وہ دجّال کے مقید ہونے کو افسانہ کیوں قرار دیتے ہیں حالانکہ جب حضرت تمیم داری نے یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے بیان کیا تھا کہ انہوں نے ایک جزیرے میں ایک شخص کو جکڑا ہوا دیکھا ہے جو اپنے آپ کو دجّال کہتا ہے، تو آنحضورؐ نے اس کی تصدیق فرمائی اور اس واقعہ کو صحابہ کے مجمع میں بیان فرمایا۔

حضرت تمیم کا یہ قصہ صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد میں بیان ہوا ہے۔ مسلم کی بعض روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود انہیں پیش آیا تھا لیکن بعض دوسری روایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ واقعہ ان کا چشم دید اور پیش آمدہ نہیں، بلکہ ان کی قوم یا خاندان کے دوسرے لوگوں کو پیش آیا تھا جو عیسائی تھے اور جن کے اسلام لانے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: ان بنی عم لتمیم الداری رکبوا فی البحر۔ دوسری کے الفاظ ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا: ان اناسًا من قومہ کانوا فی البحر... ایک تیسری حدیث میں آنحضورؐ فرماتے ہیں: کان یحدثنی تمیم الداری عن رجل...

بعض قرائن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دجّال کے سمندر میں مقید ہونے کے قصّے اہلِ کتاب میں عام طور پر مشہور تھے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (کتاب الاعتصام، باب من رأی ترک النکیر من النبی صلی اللہ علیہ وسلّم حجۃ لا من غیر الرسول) میں نعیم بن حماد کی کتاب الفتن کے حوالے سے بعض روایات کا ذکر کیا ہے جن میں دجّال کا بحیرہ یمن کے کسی جزیرے میں مقید ہونا بیان ہوا ہے اور پھر وہ فرماتے ہیں: لعل ھؤلاء مع کونہم ثقات تلقوا ذلک من بعض کتب اھل الکتاب (ان راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ انہوں نے یہ روایات بعض اہلِ کتاب کی کتابوں سے اخذ کی ہوں)۔ آگے چل کر ابن حجر

فرماتے ہیں: لشدۃ الالتباس الامر فی ذالک سلک البخاری مسلک الترجیح فاقتصر علی حدیث جابر عن عمر فی ابن صیاد ولم یخرج حدیث فاطمۃ بنت قیس فی قصۃ تمیم (چونکہ اس معاملے میں شدید التباس ہے۔ اس لیے امام بخاریؒ نے روایات کے مابین ترجیح کا مسلک اختیار کیا ہے اور صرف ابن صیاد کے متعلق حضرت جابرؓ کی اس حدیث کو لینے پر اکتفا کیا ہے جو حضرت عمرؓ کے واسطے سے مروی ہے، اور حضرت تمیم کی اُس حدیث کی تخریج نہیں کی جو فاطمہ بنت قیس نے روایت کی ہے یعنی جس میں دجّال کے قید ہونے کا ذکر ہے)۔

امام مسلم کی روایات میں بلاشبہ یہ بات آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت تمیم داری کے قصے کے متعلق فرمایا تھا کہ "وہ اس بات کے موافق ہے جو میں تم سے بیان کیا کرتا تھا"۔ لیکن یہاں جو مسئلہ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ وہ بات کیا تھی جو آنحضورؐ بالعموم دجّال کے متعلق صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا کرتے تھے اور جو حضرت تمیم کے بیان سے ملتی جلتی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ دجّال دنیا میں چار سُو فتنہ و فساد پھیلائے گا، مگر وہ مکہ اور طیبہ (مدینہ) میں داخل نہ ہو سکے گا۔ یہی بات آنحضورؐ نے متعدد مرتبہ صحابہ سے بیان فرمائی تھی اور حضرت تمیم کا قصہ دُہراتے ہوئے بھی آپ نے اسی بات پر زور دیا تھا اور اسے بیان کرتے وقت عصائے مبارک سے منبر پر ضرب لگائی تھی۔ ورنہ جہاں تک دجّال کے سمندر میں محبوس ہونے کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات نہ پہلے کبھی بیان فرمائی تھی اور نہ قصۂ تمیم سے اس کی موافقت کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ پھر مزید یہ کہ آنحضورؐ نے حضرت تمیم کے بیان کے اس حصے سے اختلاف کا اظہار ان الفاظ میں بھی فرما دیا کہ الا انہ فی بحر الشام او بحر الیمن لا بل من قبل المشرق ...

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دجّال کے کسی جزیرے میں مقید ہونے کی صراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے نہیں فرمائی۔ یہ حضرت تمیم داریؓ یا ان کی قوم کے لوگوں کا اپنا بیان ہے جس کی توثیق آنحضورؐ سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ آپؐ کے اندازِ بیان سے اس قصے کی تفصیلات کے بعض اجزاء سے آنحضرتؐ کا اختلاف اور بعض کے بارے میں سکوت ثابت ہوتا ہے۔

یہاں ایک اصولی مسئلہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضورِ نبوی میں کوئی ایسی خبر بیان کی جائے

جس سے کوئی حکم شرعی مستنبط نہ ہوتا ہو، تو اس پر آنحضورؐ کا سکوت اس خبر کو مطابق واقعہ قرار دینے کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مذکورہ باب میں مسئلۂ "تقریر" پر بحث کرتے ہوئے امام ابن دقیق العید کی تحقیق کا خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ حقیقت سے قریب تر بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاموش رہنا خبر کے واقعی اور صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ حافظ ممدوح نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ سکوتِ نبوی سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ خبر کے حق یا باطل ہونے کا امکان برابر ہو۔

مولانا مودودی کی اس بات کو بھی قابلِ اعتراض اور شانِ نبوت کے منافی قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آنحضورؐ سے دجال کے باب میں جو ارشادات منقول ہیں ان کے بعض اجزاء مبنی بر وحی نہیں، کیونکہ ان میں شک اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ لیکن ایسا سمجھنے اور کہنے میں مولانا مودودی منفرد نہیں، بلکہ دیگر محدثین اور شارحینِ حدیث کے بھی اسی طرح کے اقوال موجود ہیں چنانچہ فتح الباری کی جس بحث کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اس میں ابنِ صیاد کے الدجال ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ابن حجر فرماتے ہیں: والظاهر ان النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یوح الیه فی امره بشیئ وانما اوحی الیه بصفات الدجال وکان فی ابن صیاد قرائن محتملة فلذالک کان النبی صلی اللہ علیه وسلم لا یقطع فی امره بشیئ (ظاہر بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے بارے میں کوئی وحی نازل نہیں تھی، بلکہ آپ کو صرف صفاتِ دجال کی اطلاع بذریعہ وحی کی گئی تھی اور ابن صیاد کی شخصیت میں بعض قرائن ایسے موجود تھے جو اس کے دجال ہونے پر محتمل تھے۔ اس لیے آنحضورؐ اس کے معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں فرماتے تھے)۔ تقریباً یہی بات امام نووی نے ابن صیاد والی احادیث کی شرح کرتے ہوئے فرمائی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں: وظاهر الاحادیث ان النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یوح الیه بانه المسیح الدجال ولا غیره وانما اوحی الیه بصفات الدجال۔

جو مختصر بحث اوپر کی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک صاحبِ نظر اور منصف مزاج آدمی کو

اس امر پر مطمئن کر دینے کے لیے کافی ہے کہ مولانا مودودی نے اس مسئلے میں کوئی بات بھی ایسی نہیں کہی جو جادۂ حق اور مسلکِ سلف سے ہٹی ہوئی ہو، یا جس میں معاذ اللہ توہینِ رسالت کا ادنیٰ احتمال بھی پایا جاتا ہو (غ - ع)

بقیہ مضمون

بدیع الزمان کی شخصیت و دعوت

زندگی کو انتہائی ملول کر رہا ہے خواہ میں اس کے بعد کتنے ہی الاؤنس حاصل کروں اور کتنے ہی عیش و تنعم میں رہوں۔ اس حالت میں تو میں جیل اور قید پر ایک تاریک و وحشت ناک قبر کو پسند کروں گا۔ لیکن یہ سب اذیتیں اگر مجھے اپنی اس دعوت کی خاطر برداشت کرنا پڑ رہی ہیں جس کے لیے قضا و قدر نے مجھے مقرر کیا ہے تو امید ہے خدائے ذوالجلال مجھے مزید صبر و ثبات سے نوازے گا۔"

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ مجھ پر کوئی ظلم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، اور وہ میری برات کا فیصلہ بھی صادر کرتے ہیں تو ان کا یہ فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے میری آزادی کو بحال کریں اور اس پر کوئی ناروا پابندی نہ لگائیں۔ میں روٹی اور پانی کے بغیر تو جی سکتا ہوں لیکن آزادی کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

"بے شک جس شخص نے ۹ سال صرف ۲۰۰ ترکی لیروں (ترکی سکہ) پر گزار لیے ہوں اور کبھی صدقہ و خیرات اور دریوزہ گری سے اپنے چہرے کا پانی نہ بہایا ہو اور کبھی زکوٰۃ و تحائف سے تعرض نہ کیا ہو اس شخص کے متعلق یہ جان لینا کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ آج روپے سے زیادہ آزادی کا محتاج ہے۔"

"انسانوں سے میل جول کے انقطاع کا مجھے نعم البدل حاصل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

لاکھوں مسلمان رسائلِ نور کا مطالعہ کرتے ہیں اور مجھ سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ اگر اربابِ حکومت لوگوں کے سامنے میری زبان بندی کر سکتے ہیں تو ان رسائل کی زبان بندی نہیں کر سکتے جو براہِ لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں پہنچتے ہیں اور ان سے محوِ تکلم ہوتے ہیں۔ ہر رسالہ گفتگو اور مذاکرہ میں میرا قائمقام ہے اور اسے دنیا کی کوئی طاقت چپ نہیں کرا سکتی۔"

ترکی حکومت نے جونہی جماعتِ نور کو اپنے رہنما سے ملنے جلنے کی اجازت دی اور ان کی کتابوں اور رسالوں پر سے پابندیاں اٹھائیں، نوری تحریک اطرافِ ملک میں سیلاب کی طرح پھیل گئی اور اس کی شعاعیں وطن سے باہر پاکستان اور ہندوستان تک بھی پہنچ گئیں۔ بدیع الزمان کے رسالے ہر شہر، ہر گاؤں، ہر مسجد، ہر مدرسے اور ہر یونیورسٹی تک پھیل گئے بلکہ اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ ہزارہا کی تعداد میں ہوائی جہازوں کے ذریعے لوگوں کے سروں پر برسنے لگے۔ اور ان کو برسانے والے وہ فوجی افسر تھے جو تحریکِ نور سے وابستہ ہو گئے تھے۔

بدیع الزمان اور تحریکِ نور پھر معرضِ ابتلاء میں | حکمرانوں کے دلوں میں پھر اضطراب برپا ہو گیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب سیلابِ نور ان کو بھی لپیٹ میں لے لیگا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ الحاد اور لادینیت کی بساط روز بروز برق انگیز سرعت کے ساتھ لپٹتی جا رہی ہے۔ اور ترکی کا پڑھا لکھا اور صاحبِ دماغ طبقہ (علماء اور ادباء سے لے کر مفکرین اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر تک) جوق در جوق بدیع الزمان کی دعوت کو قبول کرتا جا رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی حکمران گروہ ایک مرتبہ پھر بدیع الزمان پر ٹوٹ پڑا۔ بدیع الزمان اور ان کے نمایاں پیروؤں کی کثیر تعداد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور انہیں صوبہ آفیون کے ہائی کورٹ میں سابقہ الزامات کے تحت ہی پیش کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۸ء میں پیش آیا۔

یہ مقدمہ ترکی میں ۱۹۴۸ء کا اہم ترین واقعہ تھا۔ اخبارات و رسائل کے کان بدیع الزمان کے بیان اور مقدمے کا فیصلہ سننے پر لگے ہوئے تھے۔ اس مقدمہ کی رُوداد اور بدیع الزمان کا بیان اور موصوف کے دوسرے ساتھیوں اور شاگردوں کے بیانات جن پر اس عدالت میں مقدمات چلائے گئے، ایک ضخیم کتاب میں "مقدمہ آفیون" کے نام سے بعد میں شائع ہوئے۔

اس مقدمہ میں، عدالت نے بدیع الزمان کے بارے میں ۲۰ ماہ قید کا فیصلہ سنایا۔ حالانکہ وکلاء اور ججوں کی بہت بڑی تعداد نے اس مقدمہ کی قانونی حیثیت ہی کو چیلنج کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ مقدمہ انہی الزامات کے تحت دائر کیا گیا تھا جن کے تحت موصوف پر پہلے مقدمہ کیا جا چکا تھا اور عدالتیں انہیں بے گناہ ثابت کر چکی تھیں اور انہی الزامات کے تحت دوبارہ انہیں مجرم گرداننے کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔ چنانچہ اس فیصلہ کو کورٹ آف اپیل میں لے جایا گیا لیکن کورٹ آف اپیل اس مقدمہ پر نظر ثانی کرنے میں برابر ٹال مٹول کرتا رہا، یہاں تک کہ ۲۰ ماہ کی مدت ختم ہو گئی ۔ حکومت بھی یہی چاہتی تھی کہ بدیع الزماں اور عوام کے درمیان رکاوٹ حائل کر دے اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کو منجمد کر دے ۔

بدیع الزماں کی وفات اس طویل کشمکش کے بعد موصوف عمر کا بقیہ حصہ لوگوں سے الگ تھلگ اسپارٹا میں بسر کرتے رہے اور اپنی وفات سے صرف تین روز پہلے اسپارٹا سے باہر قدم رکھا۔ آپ اپنے بعض شاگردوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی موٹر میں اسپارٹا سے اورفہ روانہ ہوئے ۔ آپ کی نقل و حرکت پر پابندی تھی مگر آپ نے اسپارٹا سے نکلتے وقت پولیس سے کسی قسم کی کوئی اجازت نہ لی۔ آپ ابھی اورفہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ فوج کے ایک دستے نے آپ کو روک لیا اور واپس اسپارٹا جانے کا حکم دیا۔ لیکن آپ نے موٹر میں بیٹھے ہوئے انہیں اطمینان سے یہ کہا: "آثار ایسے ہیں کہ میں آپ کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کر سکتا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اورفہ میں دو دن سے زیادہ نہیں ٹھیروں گا۔" یہ سن کر فوجی دستہ واپس چلا گیا اور آپ اورفہ میں داخل ہو گئے۔ اور دوسرے ہی روز کے بعد دنیائے اسلام نے بدیع الزمان نورسی کی وفات کی خبر سن لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ آپ کی وفات ۲۷ رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۹ھ کو ہوئی ۔

بدیع الزمان کے اخلاق و عادات سعید نورسی اپنے علم و فضل کے باوجود لکھنے کی مشق نہ رکھتے تھے۔ بڑی مشکل اور محنت سے کوئی چیز لکھ سکتے تھے ۔ اسی لیے بالعموم اپنی کتابوں اور رسالوں کو املا کے ذریعے قلمبند کرواتے تھے ۔ موصوف نے شادی نہیں کی اور تمام عمر تجرد میں گزاری۔ آپ سے جب تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: "میں جس قلق و اضطراب کی زندگی بسر کر رہا ہوں اس میں

رفیقۂ حیات کے حقوق ادا کرنا مشکل ہے"۔ بدیع الزماں کا یہ جواب بالکل درست تھا۔ موصوف نے اپنی تمام زندگی جلاوطنی، جیل اور تنہائیوں میں بسر کی ہے۔ آپ صدقات و خیرات اور تحائف سے زندگی بھر دور رہے۔ ایک مرتبہ پاکستان کی وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری نے آپ کو مالی مدد پیش کی لیکن آپ نے اُسے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور کہا: "اس سے میری زندگی کا وہ اصول جسے میں آج تک نبھاتا چلا آرہا ہوں ختم ہو جائے گا، اس زمانے میں اہلِ علم اور داعیانِ اسلام پر سب سے بڑی تہمت یہ تراشی جاتی ہے کہ یہ لوگوں سے روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں ایسی تہمتوں کا قلع قمع کرنے پر مامور ہوں اور میرے پاس جو شخص بھی کچھ لے کر آتا ہے اُسے معذرت سے مسترد کر دیتا ہوں"۔ سیکرٹری صاحب نے آپ کو پاکستان ہجرت کر آنے کی دعوت دی جہاں آپ کی دعوت اور کام کی غیر معمولی قدر ہو سکتی تھی اور آپ عذاب کی زندگی سے بھی نجات پا سکتے تھے۔ مگر آپ نے فرمایا: "عالم اسلامی کے جسم میں جو مرض گھس چکا ہے اس کا سرچشمہ یہی ملک ہے۔ لہٰذا بیماری کے سرچشمہ سے ہٹ کر کوئی کوشش سُود مند نہ ہو گی۔ عالمِ اسلامی کے بگاڑ کا اصل منبع ترکی ہے۔ یہاں ہی صیہونی منصوبے وجود میں آتے ہیں۔ اشتراکی افکار پروان چڑھتے ہیں اور فری میسن کی سازشوں کے جال بُنے جاتے ہیں۔ یہ بے وفائی ہو گی کہ میں اس اہم ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاؤں"۔

موصوف جماعتِ نُور کو برابر تلقین کرتے رہتے تھے کہ وہ اس تحریک اور تحریکی لٹریچر کو میرے نام سے منسوب نہ کریں۔ فرمایا کرتے تھے: "یہ طریقہ حقیقت کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہو گا۔ لازوال حقیقت کسی شخصیت کے کندھوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ تمہیں آگاہ رہنا چاہیے کہ میں محض ایک منادی ہوں اور لوگوں کے سامنے قرآن اور قرآن کے معجزات جو ہر زمانے میں قائم و دائم رہنے والے ہیں، کی ندا لگانے والا ہوں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہو گی کہ اس عظیم پیغام کا مجھے مظہر اور قائد ٹھیرا دیا جائے۔ یہ اس لیے بھی غلط ہے کہ میری ذات ہر وقت تہمتوں اور تنقیدوں اور ایذا رسانیوں کا نشانہ بنی رہتی ہے اور جب مجھ پر کوئی تہمت چسپاں ہو گی تو اس سے رسائلِ نور کی قیمت بھی کم ہو گی اور وہ بھی متہم ہوں گے۔ محض اس وجہ سے کہ ان کا تیار کرنے والا میں ہوں رسائلِ نور کو میری ذاتی ذات سے منسلک کر کے ان کو نقصان نہ

پہنچاؤ۔ ان کو ان کے اصل منبع سے منسلک کرو جو ہر نوع کی دست درازی سے بالا ہے۔

بدیع الزمان نے اپنے رسائل میں جو مختلف وصیتیں کی ہیں اُن میں سے آپ کی ایک وصیت یہ بھی ہے کہ آپ کا سلام شام کے علمائے کبار کو پہنچایا جائے اور اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ تحریک نور کو بھی اپنے مدارس کی اور اپنی دعوتِ اسلامی کی ایک شاخ تصور کریں اور اس کو اپنی تائید سے مشرف کریں۔ اور صرف ترکی نہیں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں اسلام کو الحاد ولادینیت کے حملوں سے بچانے کی خاطر اس کی طرف توجہ کریں اور اسے ہر ممکن طریقے سے پروان چڑھائیں۔

ضروری اعلان

دفتر ترجمان القرآن میں پچھلے سالوں کے چند پرچے برائے فروخت موجود ہیں ضرورتمند حضرات کی سہولت کے لیے ان کی قیمت میں پچاس فیصد رعایت کر دی گئی ہے۔ فائل رکھنے کے خواہشمند حضرات فوری توجہ فرمائیں۔

۱۔ جون سنہ ۴۸ء	جلد ۳۱	عدد ۲	۱۰۔ مارچ سنہ ۵۰ء	جلد ۳۴	عدد ۴
۲۔ جولائی "	" "	" ۳	۱۱۔ اپریل "	"	" ۵
۳۔ اگست سنہ ۴۸ء	" "	" ۴	۱۲۔ مئی "	"	" ۶
۴۔ ستمبر "	"	" ۵	۱۳۔ جون "	جلد ۳۴	" ۱
۵۔ جون و جولائی سنہ ۴۹ء	جلد ۳۲	" ۱،۲	۱۴۔ جولائی تا ستمبر	" "	" ۲،۳،۴،۵
۶۔ اگست سنہ ۴۹ء	" "	" ۳	۱۵۔ اکتوبر سنہ ۵۰ء	" "	" ۶
۷۔ ستمبر سنہ ۴۹ء	" "	" ۴	۱۶۔ نومبر سنہ ۵۰ء	جلد ۳۵	عدد ۱
۸۔ نومبر "	" "	" ۶	۱۷۔ دسمبر سنہ ۵۰ء	" "	" ۲
۹۔ دسمبر۔ جنوری سنہ ۴۹۔۵۰ء	جلد ۳۳	" ۱،۲،۳	۱۸۔ مارچ اپریل سنہ ۵۱ء	" "	" ۵-۴-۱

۱۹- ستمبر ۵۱ء	جلد ۳۶	عدد ۵-۶	۴۰- اکتوبر ۵۵ء	جلد ۴۵	عدد ۲
۲۰- اکتوبر ″	″ ۳۷	″ ۱	۴۱- جنوری ۵۶ء	″ ″	″ ۵
۲۱- نومبر ″	″ ″	″ ۲	۴۲- فروری ″	″ ″	″ ۶
۲۲- اپریل و مئی ۵۲ء	″ ۳۸	″ ۱-۲	۴۳- اپریل ″	″ ۴۶	″ ۲
۲۳- جولائی اگست ۵۲ء	جلد ۴۰	عدد ۴-۵	۴۴- جون ″	″ ″	″ ۴
۲۴- ستمبر ″	″ ″	″ ۶	۴۵- دسمبر ″	″ ۴۷	″ ۴
۲۵- اکتوبر	″ ۴۱	″ ۱	۴۶- جنوری ۵۷ء	″ ″	″ ۵
۲۶- نومبر	″ ″	″ ۲	۴۷- جون ۵۷ء	″ ۴۸	″ ۳-۴
۲۷- دسمبر	″ ″	″ ۳	۴۸- جولائی ″	″ ″	″ ۴
۲۸- مارچ ۵۳ء	″ ۴۱	″ ۶	۴۹- اگست ″	″ ″	″ ۵
۲۹- اپریل ″	″ ۴۲	″ ۱	۵۰- ستمبر ″	″ ″	″ ۶
۳۰- جولائی ″	″ ″	″ ۴	۵۱- اکتوبر و نومبر ۵۷ء	جلد ۴۹	″ ۱-۲
۳۱- اگست ۵۴ء	جلد ۴۲	″ ۵	۵۲- دسمبر ″	″	″ ۳
۳۲- ستمبر ″	″ ″	″ ۶	۵۳- فروری ۵۸ء	″	″ ۵
۳۳- مارچ ۵۵ء	″ ۴۳	″ ۶	۵۴- مارچ ″	″	″ ۶
۳۴- اپریل ″	″ ۴۴	″ ۱	۵۵- اپریل ″	″ ۵۰	″ ۱
۳۵- مئی ″	″ ″	″ ۲-۳	۵۶- ستمبر ″	″ ″	″ ۶
۳۶- جون ″	″ ″	″ ۴	۵۷- اکتوبر ″	″ ۵۱	″ ۱
۳۷- جولائی ″	″ ″	″ ۵	۵۸- دسمبر ″	″ ″	″ ۳
۳۸- اگست ″	″ ″	″ ۶	۵۹- جنوری ۵۹ء	″ ″	″ ۴
۳۹- ستمبر ″	″ ۴۵	″ ۱	۶۰- مارچ ″	″ ″	″ ۶

۶۱- اپریل ۱۹۵۹ء	جلد ۵۲	عدد ۱	۷۹- جنوری ۱۹۶۱ء	جلد ۵۵	عدد ۴
۶۲- مئی 〃	〃 〃	〃 ۲	۸۰- فروری 〃	〃 〃	〃 ۵
۶۳- جون 〃	〃 〃	〃 ۳	۸۱- مارچ 〃	〃 〃	〃 ۶
۶۴- جولائی 〃	〃 〃	〃 ۴	۸۲- مئی 〃	〃 ۵۶	〃 ۲
۶۵- اگست 〃	〃 〃	〃 ۵	۸۳- جون 〃	〃 〃	〃 ۳
۶۶- ستمبر 〃	〃 〃	〃 ۶	۸۴- جولائی 〃	〃 〃	〃 ۴
۶۷- اکتوبر 〃	جلد ۵۳	〃 ۱	۸۵- اگست 〃	〃 〃	〃 ۵
۶۸- نومبر 〃	〃 〃	〃 ۲	۸۶- ستمبر 〃	(نمبر) 〃	〃 ۶
۶۹- دسمبر 〃	〃 〃	〃 ۳	۸۷- اکتوبر 〃	جلد ۵۷	〃 ۱
۷۰- فروری ۱۹۶۰ء	〃 〃	〃 ۵	۸۸- نومبر 〃	〃 〃	〃 ۲
۷۱- مارچ 〃	〃 〃	〃 ۶	۸۹- دسمبر 〃	〃 〃	〃 ۳
۷۲- اپریل 〃	〃 ۵۴	〃 ۱	۹۰- جنوری ۱۹۶۲ء	〃 〃	〃 ۴
۷۳- مئی 〃	〃 〃	〃 ۲	۹۱- مارچ 〃	〃 〃	〃 ۶
۷۴- جون 〃	〃 〃	〃 ۳	۹۲- اپریل 〃	〃 ۵۸	〃 ۱
۷۵- اگست 〃	〃 〃	〃 ۵	۹۳- جون 〃	〃 〃	〃 ۳
۷۶- ستمبر 〃	〃 〃	〃 ۶	۹۴- جولائی 〃	〃 〃	〃 ۴
۷۷- اکتوبر 〃	〃 ۵۵	〃 ۱	۹۵- اگست 〃	〃 〃	〃 ۵
۷۸- دسمبر 〃	〃 〃	〃 ۳	۹۶- اکتوبر 〃	〃 ۵۹	〃 ۱

(نوٹ) دسمبر ۱۹۶۱ء جلد ۵۷ عدد ۳ تک کے پرچوں کی نصف قیمت وصول کی جائے گی۔ سوائے منصب رسالت نمبر پرچہ کے اس کے بعد کے پرچوں کی قیمت پوری وصول کی جائے گی۔ ڈاک خرچ دونوں صورتوں میں خریدار ہوگا۔

منیجر ترجمان القرآن لاہور